# انہونی

نکہت سیما

نگہت سیما

# انہونی

کبھی کبھی ان ہونی ہو جاتی ہے۔

میرے ساتھ بھی انہونی ہی ہوئی ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں حاجرہ منیر حسین نچلے متوسط طبقے کی لڑکی اور وہ۔۔۔

مجھے یقین نہیں آتا، لیکن پھر بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ یعنی واقعی کبھی کبھی انہونی ہو ہی جاتی ہے اور میں حاجرہ منیر حسین۔۔۔ یہ منیر حسین کا لاحقہ بھی میں نے خود ہی اپنے نام کے ساتھ لگایا ہے، ورنہ بے بے نے تو میرا نام حاجرہ پروین رکھا تھا اور وہ اب بھی مجھے حاجرہ پروین

ناولٹ

کہہ کر ہی بلاتی ہے، لیکن میں جب میٹرک کا فارم پُر کرنے لگی تھی تو مجھے اپنا نام بڑا غریب اور مسکین سا لگا تھا۔ حالانکہ بے بے کہتی تھی۔۔۔

"تیرا نام تو میں نے بی بی حاجرہ کے نام پر رکھا ہے۔ اتنا سوہنڑا اتنا پاک نام۔"

لیکن اس روز جب ہم فارم پر کر رہے تھے تو صائمہ مصطفیٰ چوہدری، یسریٰ صادق خان، عصفور الملک جیسے نام سن کر میں دل میں بڑی چھوٹی سی ہو گئی تھی۔ جیسے ہمارے اسکول کی مائی پروین اختر۔۔۔ سو میں نے اپنے فارم پر لکھ دیا۔ حاجرہ منیر حسین۔ ڈاٹر آف راجہ منیر حسین پھر فارم چیک کرتے ہوئے میری ٹیچر نے حاضری کے رجسٹر پر نظر ڈالی۔

"یہاں تو حاجرہ پروین لکھا ہے۔"

"لیکن میرا نام حاجرہ منیر حسین ہے۔"

"اچھا کل ذرا اپنا برتھ سرٹیفکیٹ لے کر آنا۔"

"ٹھیک ہے۔ لے آؤں گی۔"

میں نے کہہ دیا تھا، لیکن نہ تو ابا نے میرا برتھ سرٹیفکیٹ بنوایا تھا نہ کمیٹی کے دفتر میں اندراج کرایا تھا۔ تب اتنی چیکنگ بھی نہیں ہوتی تھی۔ نہ ب فارم کا جھگڑا ہوتا تھا۔ بس اسکول میں داخل کرواتے ہوئے جو عمر لکھوا دی، لکھوا دی۔۔۔

میں چھ سال کی تھی، لیکن جب میرا ماما مجھے اسکول داخل کروانے لے گیا تو اس نے میری عمر پانچ سال لکھوا دی۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ میری تاریخ پیدائش کیا ہے۔ تاہم اماں نے اسے بتایا تھا کہ جیٹھ کا

مہینہ تھا۔ باہر سورج آگ اگل رہا تھا۔ ماما نے میری تاریخ پیدائش یونہی اندازے سے 29 اگست لکھوادی تھی۔۔۔ یوں مجھے کبھی صحیح سے پتا نہ چل سکا کہ میرا اسٹار کیا ہے۔۔۔ میں اپنی فرضی تاریخ پیدائش کے حساب سے سب کو اپنا اسٹار سنبلہ ہی بتا دیتی تھی۔۔۔ ابا کو تو ان باتوں کی سمجھ نہ تھی، لیکن ماما پڑھا لکھا تھا۔ اس نے میرا اندراج بھی کروایا اور پیدائش کا سرٹیفکیٹ بھی بنوا دیا۔۔۔ رشوت دی تھی یا تعلقات سے کام چلایا تھا، لیکن کام ہو گیا تھا۔ میں نے ماما کو بتا دیا کہ میں نے اپنے فارم پر اپنا کیا نام لکھا ہے۔ تب ماما بہت ہنسا تھا، لیکن اس نے میری مرضی کے مطابق کام کروا دیا تھا۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ میرے ساتھ انہونی ہو گئی ہے۔ ویسے تو میرے ساتھ زندگی میں کئی بار انہونی ہوئی۔ میری تو پیدائش بھی انہونی ہی تھی۔ جب اماں ابا بالکل مایوس ہو گئے تو میں آ گئی۔

انہونی سی انہونی!

تسبیح کے دانے گراتے گراتے بے بے کی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے میں کون سی بن گئی تھی، پر وہ تخت پر بیٹھی دانے گرائے جاتی اور دعائیں مانگتی جاتی۔

"اللہ میرے منوں کی کھیتی بھی ہری کر۔"

اب پتا نہیں بے بے کی دعا میں اثر نہیں تھا یا اللہ کو ابا کا امتحان مقصود تھا کہ اس نے ابا کی کھیتی کو ہرا تو کیا پیلا بھی نہیں کیا۔ اماں ڈاکٹروں سے مایوس ہوئی تو فقیروں کے پاس اور درگاہوں پر جانے لگی۔ بھاگ بھاگ کر تھک گئی۔ تعویذ گنڈے، دوائیں سب آزما کر دیکھ لیں تو آنکھوں میں آنسو بھر کے ابا سے کہا۔

"منیر حسین! ہماری اولاد نہیں ہونے کی۔ اب تو چاہے تو اولاد کی خاطر بھلے دوسری شادی کر لے۔"

"چل چپ کر پھر نہ کہنا ایسی بات اللہ کی رضا پر راضی ہو جا۔"

اور اماں تو اللہ کی رضا پر خود کو راضی رکھنے کی کوشش میں لگ گئی اور بے بے نے ایک روز تسبیح گھٹنے کے نیچے رکھ کر ابا سے کہا۔

"سن منیر حسین۔۔۔!"

جب بے بے کو ابا سے کوئی خاص بات کرنا ہوتی تھی تو وہ ابا کو منیر حسین کہہ کر بلاتی تھی ورنہ وہ اب تک بے بے کا منوں تھا۔

"جی بے بے۔۔۔!" ابا اپنا تھیلا رکھ کر اس کے پاس ہی تخت پر بیٹھ گیا تھا۔۔۔ میں نے جب سے آنکھ کھولی ــــ ابا کو اس تھیلے کے بغیر نہیں دیکھا۔ اس تھیلے میں آری، بسولا، رندہ، فیتہ اور لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ڈک (لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے) ہوتے تھے۔

"سن منیر حسین!" بے بے نے اپنی بات دہرائی تھی۔

"جی بے بے حکم کر۔۔۔" یہ ابا کا خاص جملہ تھا، جسے میں نے ابا کو ہمیشہ بے بے کی کہی بات پر کہتے سنا تھا۔

"بہت دعائیں کرلیں۔ سب فقیروں، درگاہوں کو آزما لیا۔۔۔ ڈاکٹروں کو دیکھ لیا۔ پر نہ رحمت نصیب ہوئی نہ نعمت ملی۔۔۔"

"تو؟" ابا نے سوالیہ نظروں سے بے بے کو دیکھا تھا۔

"تو یہ کہ میرے پتر! اب اور کتنا دیکھیں۔ سولہ سال دس مہینے اور آٹھ دن ہو گئے تیری شادی کو اور تیری بیوی چوہیا کا ایک بچہ بھی نہ جن سکی۔"

ابا ہنس پڑا تھا۔ اسے دو باتوں پر ہنسی آئی تھی۔ ایک تو چوہیا کے بچے والی بات پر اور دوسرا اپنی شادی کا اتنا صحیح حساب بتانے پر۔

"لگتا ہے بے بے! تو نے ایک ایک دن کا حساب رکھا ہے۔"

"ہاں تو میں کب بھولی ہوں ستمبر کا مہینہ تھا اور چودہ تاریخ اور۔۔۔"

"مجھے تو یاد نہیں رہا بے بے! پر تجھے خوب یاد ہے۔"

"چل بات نہ بدل۔۔۔ تو میں کیا کہہ رہی تھی۔"

"بے بے! تو چوہیا کے بچے کی بات کر رہی تھی تو



صالحہ تو انسان ہے وہ بھلا کہاں چوہیا کا بچہ پیدا کر سکتی ہے۔" وہ پھر ہنسا تھا۔

"چل بک بک نہ کر بس اب میں نے سوچ لیا ہے تیری شادی کرنے کا۔ تیری بیوی تو خالی ٹھونٹھ ہے۔"

"یہ تو اللہ کی مرضی ہے۔ بے بے اس میں اس نمانی۔۔۔ کا کیا قصور اور میں بھی راضی ہوں اللہ کی مرضی پر۔"

ابا بڑا ہی صابر اور قناعت پسند بندہ تھا۔ سالن نہ ہوتا تو اچار سے روٹی کھا لیتا۔ اچار نہ ہوتا تو چارپائی کے پائے پر پیاز رکھ کر مکا مار کر اسے توڑتا۔ چھلکے الگ کر کے پھینکتا اور اسی سے روٹی کھا لیتا۔ جو وہ بھی نہ ہوتا تو سوکھی روٹی بھی کھا لیتا۔ پر بے بے کا صبر تو سولہ سال دس ماہ آٹھ دن تک آ کر ختم ہو گیا تھا۔

"سن لے منیرے! قصور وصور مجھے نہیں پتا۔ اب میں تیری دوسری شادی کرواؤں گی۔ کروا کر رہوں گی۔"

ابا نے پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ "یہ صالحہ کدھر ہے؟"

"بدہضمی ہو گئی تھی ڈاکٹر کے پاس گئی ہے۔ رات چنوں کی دو پلیٹیں جو کھا گئی تھی۔ صبح سے ڈکار رہی تھی۔"

"چھوڑ بے بے! مجھے بھلا کس نے رشتہ دینا ہے۔ بس صبر شکر کرلے۔"

"میں نہیں کرنے کی اب صبر۔ اور یہ تو نے خوب کہی۔ بھلا کوئی کیوں رشتہ نہیں دے گا۔ پکا سیمنٹ والا اپنا گھر ہے۔ اپنا کھاتا ہے اپنا کماتا ہے۔ اس پر اتنا سوہنا کہ میں تو نظر لگ جانے کے ڈر سے کبھی نظر بھر کر دیکھتی ہی نہیں۔"

"تو بھی بے بے بس۔"

ابا خوامخواہ ہی ہنس دیا تھا لیکن اماں تو دل سے ہنستی ہوئی اندر داخل ہوئی اور آتے ہی بے بے سے لپٹ گئی تھی۔

"بے بے! اللہ نے تیری دعائیں سن لیں۔"

انہونی ہو گئی تھی، پر نہ بے بے کو یقین آ رہا تھا نہ ابا کو۔

ابا کی کھیتی میں بیج پھوٹ پڑا تھا۔ بے بے اتنی خوش تھی کہ اس نے پورے محلے میں بتاشے بانٹے تھے۔

"اور کیا آپ بھی خوش ہوئے تھے اماں کی بات سن کر؟" ایک روز میں نے شرارت سے پوچھا تھا۔

"لو بھلا میں کیوں خوش نہ ہوتا؟"

"دوسری شادی کا معاملہ جو کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔" میں پھر شرارت سے بولی۔

"چل شریر!"

ابا ہولے سے مجھے دھپ لگاتا اور گیلی لکڑیوں کو جلانے کی کوشش میں پھونکنی سے پھونکیں مار مار کر آگ جلاتی اماں کے کان "دوسری شادی" پر کھڑے ہو جاتے تھے اور وہ لکڑیوں کو آگے پیچھے کرتے ہوئے مشکوک نظروں سے مجھے اور ابا کو دیکھتی جاتی۔

بے بے اور ابا نے اس روز کی بات مجھے اتنی بار بتائی تھی کہ مجھے لگتا تھا جیسے اس روز میں نے سب اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔

میرا ابا ذات کا ترکھان تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا ہنر تھا۔ بے بے نے مجھے بتایا تھا جب ابا گاؤں میں تھا تو گاؤں کی ساری کڑیوں کے جہیز کے میز، کرسیاں، پلنگ، رحل ایسے بناتا تھا کہ آنکھیں کھلی رہ جاتی تھیں۔ سات گراؤں میں تیرے ابا اور دادا کے ہاتھ کے بنے فرنیچر کی مانگ تھی۔ چھوٹی عمر میں ہی تیرے دادا نے اسے اپنے ساتھ کام پر لگا لیا۔۔۔ پر نصیب خراب تھے سب چھوڑ چھاڑ گاؤں سے نکلنا پڑا۔ دکان میں پار گاؤں کے زمین دار کی بیٹی کے جہیز کا سامان بن رہا تھا۔ پیڑھے شیشوں والے اونچی پشت والے پلنگ اور میز کرسیاں کسی ظالم نے آگ لگا دی۔ عمر بھر کی پونجی ختم ہو گئی۔

یہ سب بے بے نے ہی مجھے بتایا تھا۔ اماں ابا نے کبھی ماضی کا ذکر نہ کیا۔

ابا تھا تو ترکھان لیکن میں نے جب سے ہوش سنبھالا اسے تھیلا کندھے پر ڈالے گلی گلی آواز لگاتے دیکھا تھا۔

"منجی پیڑی ٹھکالو۔"

ابا اگر ہنر مند تھا جیسا بے بے کہتی تھی تو ہو گا کبھی' لیکن اب تو منجیاں (چارپائیاں) ٹھونکنے کا کام کرتا تھا اور اتنا کما لیتا تھا کہ گزارہ ہو جاتا تھا۔ اتنی مہنگائی بھی نہیں تھی تب چھوٹا شہر تھا۔۔۔

ایک دفعہ میں نے پوچھا تھا کہ یہاں شہر میں کوئی دکان کیوں نہ بنالی۔

"بس پتر! سب نصیب کے کھیل ہیں۔ جب نیا نیا شہر آیا تھا تو کسی دکان پر مزدوری بھی نہ ملی تو بس یہ کام شروع کر دیا۔"

ابا نے مجھے تفصیل تو نہیں بتائی تھی لیکن اب میں اندازہ کر سکتی ہوں کہ انہیں نئی جگہ پر سروائیو کرنے کے لئے کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہو گا' مکان اپنا تھا۔۔۔ شاید ابا نے ساری جمع پونجی یہ مکان خریدنے پر لگا دی ہو گی۔۔۔ اماں نے گھر اچھا سنوار کر رکھا ہوا تھا۔ ضرورت کی ہر چیز ہی تھی۔ اماں اور بے بے کروشیے کا کام بھی کر لیتیں۔ کچھ بچت بھی کر رکھی تھی۔

اماں ابا دونوں ہی بے حد خوب صورت تھے۔ اماں تو بہت ہی خوب صورت۔ منہ دھو کر تیل لگا کر چٹیا کر کے ذرا سا دنداسہ ہی مل لیتی تو چمک اٹھتی تھی۔ اس لیے تو ابا نے سولہ سال دس مہینے آٹھ دن دوسری شادی کا سوچا بھی نہیں۔ پر میں ان دونوں جتنی خوب صورت نہ تھی۔ گندمی سے رنگ کی بے حد عام سے نقش و نگار والی لڑکی تھی جیسے سینکڑوں ہزاروں لڑکیاں ہوتی ہیں۔ سینکڑوں لڑکیوں میں میری اپنی کوئی الگ پہچان نہ تھی کہ میں لڑکیوں کے ہجوم میں الگ سے نظر آؤں۔ حالانکہ بے بے کے کھنڈر بھی بتاتے تھے کہ عمارت یقیناً "شان دار ہو گی۔

بے بے میری سہیلی بھی تھی اور دادی بھی۔ مجھے اس سے ماضی کی باتیں سننا بہت اچھا لگتا تھا جیسے کہانیاں ہوں۔

جب میں پانچ سال کی ہوئی تو ابا نے دبے دبے لفظوں میں کہا۔

"بے بے! حاجرہ کو اسکول میں نہ داخل کرا دیں۔"

"ہرگز نہیں۔۔۔ بس مولوی صاحب کی بیوی کے پاس بٹھا دوں گی کل۔۔۔ قرآن پڑھ لے' نماز' روزہ کر لے تو بس بہت۔"

ابا بے بے کے سامنے کم ہی بولتا تھا اور بولتا بھی تو ایک ہی بات۔

"حکم کرو بے بے!"

اور ابا نے بے بے کا یہ حکم بھی مان لیا۔ میں مولوی صاحب کے گھر جانے لگی۔

پر پھر ایک انہونی ہو گئی۔

اس روز میں بے بے کے تخت پر بیٹھی قرآنی قاعدہ کھولے سبق دہرا رہی تھی کہ ابا نے گھر میں قدم رکھا' لیکن ابا اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک مرد' ایک عورت اور ایک بچی بھی تھی۔

"الطاف!" اماں جو صحن میں حمام کے پاس بیٹھی برتن دھو رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے چلائی تھی اور پھر دوپٹے سے صابن بھرے ہاتھ پونچھتی اٹھ کر اس مرد سے لپٹ گئی تھی۔

"میرا ویر' میرا ماں جایا۔ میرا بھرا۔" وہ رو رہی تھی اور وہ مرد اسے تسلی دے رہا تھا۔

اور میں حیرت سے تخت پر بیٹھی اسے دیکھتی تھی۔

یہ میرا ماما تھا۔ گورا چٹا' اونچا لمبا' اماں جیسا خوب صورت اور وہ عورت میری مامی تھی۔ واجبی سی شکل و صورت کی اور مامی کی انگلی پکڑے سرخ چیک دار فراک پہنے بچی ان کی بیٹی تھی۔ واجبی سے بھی کم شکل کی۔ پھینی سی ناک' چوڑا ماتھا اور چندھی آنکھیں۔

جب اماں' ابا اور بے بے نے گاؤں چھوڑا تھا تو کسی کو اپنا اتا پتا نہیں بتایا تھا۔ ابا کا تو کوئی سگا تھا نہیں' لیکن ساتھ والے گاؤں میں اماں کا میکہ تھا۔۔۔ دو بھائی ایک بہن۔ بڑا بھائی اور بہن شادی شدہ تھے۔ چھوٹا بھائی الطاف دسویں میں پڑھتا تھا۔ ماں باپ سال پہلے آگے پیچھے گزر گئے تھے۔ شاید انہوں نے جلدی میں گاؤں چھوڑا تھا اس لیے اماں کے میکے والوں کو بھی اتا پتا نہیں بتایا تھا۔ ماما دو سال پہلے شہر آیا تھا اور اس روز ابا جب منجی ٹھکالو کی آواز لگاتا محلہ قصاباں سے گزر رہا تھا تو مامے نے پیچھے سے آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"بھائیا جی۔ میں الطاف!" اور یہ کیسی انہونی ہوئی تھی اس روز اماں نے میرا منہ چوم کر لال کر دیا تھا۔

"تو بڑی بھگوان ہے' بڑے نصیبے والی۔" اس روز اماں روئی بھی تھی اور ہنسی بھی تھی۔ مامے الطاف نے بتایا تھا کہ اس نے چودہ جماعتیں پڑھ کر ادھر قصبے میں نوکری کر لی تھی اور اب اپنی دھی رانی کے لیے شہر آئے تھے۔ مامے کی یہ ایک ہی بیٹی تھی۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں چھوٹی عمر میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے اور ماما اپنی بیٹی کو بہت سارا پڑھانا چاہتا تھا اچھے انگریزی اسکولوں میں۔ اس لیے دو سال پہلے اس نے یہاں نوکری کر لی تھی۔

وہ مجھ سے تھوڑی سی بڑی ہو گی اور شکل و صورت میں بالکل گئی گزری' لیکن جب اس نے اشاروں سے مٹک مٹک کر "ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار" سنائی تو سب ہی اس پر واری صدقے ہونے لگے اور ابا نے جیب سے اسے ایک روپیہ نکال کر انعام دیا تھا۔ اس وقت ایک روپے کی بڑی ویلیو تھی۔ پورے سولہ آنے ہوتے تھے اس میں۔۔۔ میں چھ سال کی تھی اور وہ مجھ سے تھوڑی سی بڑی تھی' لیکن مجھے اس وقت اس سے دل میں بڑی جلن محسوس ہوئی تھی اس لیے کہ اس کے پاس ایک روپیہ تھا اور مجھے تو کبھی کبھی ابا ایک آنہ دو آنے دے دیتا تھا۔

پھر اس نے اسی طرح اشارے کر کر کے کئی نظمیں سنائی تھیں اور سچ تو یہ ہے کہ نظم سناتے ہوئے وہ مجھے بھی اچھی لگ رہی تھی۔

کٹے ہوئے بال۔ چیک دار فراک' سفید موزے اور سرخ و سفید بوٹ۔

میں اپنے گھر کی منظور نظر تھی۔ ابا' بے بے اور اماں کی آنکھ کا تارا' لیکن اب سب اسے دیکھ رہے تھے' سراہ رہے تھے۔۔۔ میں نے چپکے چپکے اس کا اور اپنا موازنہ کیا۔

بے بے نے صبح اچھی طرح تیل لگا کر کس کر میری

چٹیاں بنائی تھی اور میں نے چھینٹ کی پھول دار قمیص اور شلوار پہن رکھی تھی۔ شکل و صورت میں تو میں اس سے ہزار درجے اچھی تھی، لیکن اس وقت تو وہ ہی وہ تھی۔ بالکل میموں جیسے کپڑے پہنے۔

اس روز میں نے بے بے سے دو فرمائشیں کی تھیں۔ ایک یہ کہ مجھے بھی ایسا ہی فراک اور جوتے لے دیں اور دوسری یہ کہ مجھے بھی ایسے ہی پوئم پڑھنا سکھا دیں۔ بے بے تو سٹپٹا گئی۔ اسے پوئم کہاں آتی تھی۔ اس نے ابا سے کہا تھا۔

"سن منیر حسین!"

"حکم کرو بے بے جی!" ابا کے لبوں سے نکلا تھا۔

"سن! اپنی ہاجرہ کو بھی کل ملکہ والے اسکول میں داخل کروا دے۔"

اس کا نام ملکہ تھا۔ میں کمبل میں منہ چھپا کر خوب ہنسی تھی۔ بھلا ملکائیں ایسی ہوتی ہیں۔ اتنی کالی، اتنی پھینی۔۔۔

☼ ☼ ☼

اس روز میں اندر کمرے میں کمبل لے کر لیٹی ہوئی تھی اور وہ باہر بے بے اور اماں کے پاس بیٹھی تھی۔ ماما اس کا دل بہلانے کے لیے ادھر لایا تھا۔ اس کا موڈ بہت خراب تھا کیونکہ اس کی ٹیچر نے اسکول کے فنکشن میں ہونے والے ڈرامے میں اسے کوئن بنانے کے بجائے جادوگرنی بنا دیا تھا۔ اماں اسے پیار کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"تو تو ویسے بھی ملکہ ہے۔ سچ مچ کی ملکہ۔ تجھے بھلا جھوٹ موٹ کی ملکہ بننے کی کیا ضرورت ہے۔"

اور میں اندر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

تو میں کہہ رہی تھی کہ اس روز انہونی ہو گئی تھی۔۔۔ ایک نہیں دو انہونیاں ہوئی تھیں۔

ایک تو برسوں کے بچھڑے، بہن بھائی مل گئے تھے۔ اور دوسرا ابا نے مجھے اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ ملکہ والے اسکول تو نہیں کیونکہ وہ دور تھا، لیکن جس اسکول میں داخل کروایا تھا وہ بھی انگریزی اسکول تھا۔

ہماری زندگیوں میں ایک تبدیلی آگئی تھی۔ اب کبھی ماما، مامی اور ملکہ آجاتے اور کبھی ہم ان کے گھر چلے جاتے۔

میرا بڑا ماما تو کراچی میں تھا اور ماسی بھی۔ ایک بار مامے نے اماں سے سب کی بات کروائی تھی۔ اماں خوش تھی۔ ملکہ کا بولنا، اٹھنا بیٹھنا، لباس۔۔۔ میں ہر چیز سے جلتی تھی۔ حالانکہ ملکہ ۔۔۔ بہت محبت سے ملتی تھی اور گھنٹوں مجھ سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ اس کی بہت سی سہیلیاں تھیں، لیکن وہ کہتی تھی "میری اصل اور گوڑھی سہیلی تو بس تو ہے حاجرہ! میری بہن۔"

وہ مجھ سے ایک سال آگے تھی اور بہت لائق تھی۔ ہر سال فرسٹ آتی تھی۔ اس کی الماری میں اس کے جیتے ہوئے بہت سے انعام پڑے تھے۔ کپ، شیلڈ اور کتابیں۔۔۔ اس سے جلنے کا ایک فائدہ مجھے یہ ہوا تھا کہ میں بھی اس کی طرح فرسٹ آنے کے لیے بہت محنت کرنے لگی تھی، لیکن گھر میں نہ ابا ماما کی طرح پڑھا لکھا تھا نہ اماں مامی کی طرح دس جماعتیں پاس تھی۔ تو ابا مجھے وہ بات نہیں سمجھا سکتا تھا جو میں سمجھ نہ پاتی تھی جبکہ ملکہ کو ماما خود پڑھاتا تھا۔

ان کا گھر نزدیک ہوتا تو ماما مجھے بھی پڑھا دیتا، لیکن ان کا گھر دور تھا اور ابا صبح کا گیا رات کو تھکا ہارا گھر آتا تھا۔

جب میں ساتویں میں تھی تو پھر ایک انہونی ہو گئی۔۔۔ انہونی ہی تو تھی۔۔۔ سائرہ نے ساتویں میں ہی ایڈمیشن لیا تھا۔ خوش شکل تو وہ تھی ہی، لیکن امیر بھی بڑی تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر آتی تھی اور ایک ملازمہ گاڑی سے اتر کر جماعت کے کمرے تک اس کا بستہ اٹھا کر لاتی تھی۔ وہ بہت مغرور تھی۔ کسی سے بات نہ کرتی تھی۔

کئی لڑکیاں اس سے دوستی کرنا چاہتی تھیں لیکن اس نے کسی سے دوستی نہ کی بلکہ جو لڑکی اس کے ساتھ بیٹھتی تھی، اس سے بھی بات نہ کرتی تھی۔ اس کا بیگ بہت خوبصورت اور قیمتی تھا۔ اس کا پنسل باکس بھی بہت اچھا تھا۔ سب لڑکیاں چوری چوری اس کی چیزیں



دیکھتی تھیں۔ حالانکہ باقی سب لڑکیاں بھی اتنی غریب نہ تھیں۔ اچھے کھاتے پیتے گھرانوں کی تھیں۔ ایک میں ہی تھی، جو نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی اور میری فیس، کتابوں اور یونیفارم کے لیے ابا اور اماں کو ڈبل محنت کرنا پڑتی تھی۔

میرے جیسے نچلے متوسط طبقے کی لڑکیاں تو عام سرکاری اسکولوں میں پڑھتی ہیں لیکن یہ بے بے کا حکم تھا کہ صالحہ کی بھتیجی اگر انگریزی اسکول میں پڑھ سکتی ہے تو پھر بیٹی کیوں نہیں۔

ایک روز سائرہ اپنا بیگ اٹھا کر میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"مس! میں یہاں بیٹھوں گی حاجرہ کے پاس۔"

اور ٹیچر نے میری سیٹ فیلو کو اٹھا کر اس کی جگہ بٹھا دیا۔

"میرے ساتھ دوستی کرو گی؟"

"ہاں!" میں نے سر ہلا دیا تھا۔

اور ساری لڑکیوں کی آنکھیں جیسے حیرت سے پھٹ گئی تھیں۔ میں جو کلاس کی سب سے غریب لڑکی تھی اور شکل سے ہی پینڈو لگتی تھی، سائرہ نے دوستی کے لیے اسے چنا تھا حالانکہ وہ سب اس سے دوستی کرنا چاہتی تھیں۔

میں نے کپڑے تو سب لڑکیوں جیسے ہی پہنے ہوتے تھے کہ وہ یونیفارم تھا۔ سفید بلاؤز، گرے اسکرٹ اور سفید شلوار لیکن میری لک کچھ پینڈو سی تھی کیونکہ بے بے اب بھی خوب تیل لگا کر اور کس کر میری چٹیا بناتی تھی۔

سائرہ نے مجھے اپنی سہیلی بنا لیا تھا۔ اور جب میں نے یہ بات ملکہ کو بتائی تو اسے کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔ وہ اس وقت آٹھویں جماعت میں تھی اور پڑھائی کے علاوہ کھیلوں اور تقریروں میں بھی کئی انعام جیت چکی تھی۔

"غربت یا امیری دوستی کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی حاجو! تم اسے اچھی لگی ہو گی۔ شاید تمہارے اندر اسے کوئی ایسی خوبی نظر آئی ہو گی جس نے اسے متاثر کیا ہو گا۔"

مجھے تو کوئی خوبی اپنے اندر نظر نہیں آئی تھی سوائے اس کے کہ حساب میں میرے سو میں سے سو نمبر آتے تھے۔ کیونکہ ماما نے پورے تین مہینے تک اتوار کو آکر مجھے حساب کے سوال سکھائے تھے اور اب مجھے اتنی ضرورت نہ رہی تھی سمجھنے کی پھر بھی کوئی مشکل آتی تو ابا مجھے ماما کے گھر چھوڑ آتا تھا۔

کلاس کے علاوہ بریک میں بھی ہم ساتھ ہی ہوتی تھیں۔ اس کا نوکر بریک میں کھانا لاتا۔ تین ڈبوں والے ٹفن میں دو طرح کے سالن اور روٹی ہوتی تھی۔ میں بھی سلور کی ایک گول ڈبی میں پراٹھے میں کبھی آلو کی بھجیا، کبھی اچار اور کبھی آملیٹ رکھ کر لاتی تھی۔

سائرہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیتی۔

چھٹی جماعت میں آنے کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کا سیکشن الگ الگ ہو گیا تھا۔ لڑکیوں کے سیکشن میں اب میں ہی فرسٹ آتی تھی اور سائرہ نے اگر کلاس کی سب سے لائق لڑکی سے دوستی کر لی تھی تو یہ ایسی انہونی بھی نہیں تھی۔

لیکن پھر ایک اور انہونی ہو گئی۔

ایک روز سائرہ نے مجھے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی تھی۔ اس کے چھوٹے بھائی کی سالگرہ تھی۔

میرا جانا تو کچھ مشکوک سا تھا پھر بھی میں نے سر ہلا دیا تھا۔ اور اتنے دنوں بعد اچانک اسے خیال آیا تھا کہ وہ مجھ سے اماں ابا کے متعلق پوچھے۔

"تمہارے ابا کیا کرتے ہیں حاجرہ؟"

"میرے ابا ترکھان ہیں۔" مجھے لگا تھا جیسے ترکھان ہونا چارپائیاں ٹھونکنے والا ہونے سے اچھا ہے۔

اور اس نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا تھا۔ "لگتا تو نہیں۔"

"کیا مطلب کیا میرے ماتھے پر لکھا ہونا چاہیے کہ میرا ابا ترکھان ہے۔"

اس کی دوستی نے مجھے کچھ اعتماد بھی دے دیا تھا۔

"نہیں یار!" وہ ہنس دی تھی۔ "میری دادی کہتی

ہیں یہ جو ٹھوکے ہوتے ہیں ان کمبختوں کے ہاں بڑا حسن ہوتا ہے۔"

"ٹھوکے کیا؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"یار! میری دادی پرانے زمانے کی عورت ہیں اور وہ ترکھانوں کو ٹھوکے کہتی ہیں پتا نہیں کیوں۔" وہ پھر ہنسی تھی۔

"اور تم تو بالکل بھی خوبصورت نہیں ہو۔ ہاں تمہارے بال اچھے ہیں۔ لمبے گھنے سلکی۔ جبکہ دادی کہتی ہیں ایسا لگتا ہے کہ سارا حسن اور خوبصورتی ہمارے گاؤں کے ٹھوکوں کے نام ہی لکھ دیا تھا سوہنڑے رب نے۔"

"میری اماں اور میرے ابا دونوں ہی بہت خوبصورت ہیں اور بے بے بھی کم نہیں۔" میں نے پہلی بار اماں ابا کا ذکر فخر سے کیا تھا۔

"دراصل۔" اس نے مجھ سے اپنا راز شیئر کیا تھا۔

"دادی چڑ کر ایسا کہتی ہیں۔ تم جب ہمارے گھر آنا تو میری دادی کو ہرگز یہ نہ بتانا کہ تمہارے ابا ترکھان ہیں۔ مجھے پتا ہے، وہ تم سے سوال ضرور پوچھیں گی کیونکہ انہیں سب کے حسب نسب جاننے کا بہت شوق ہے۔ دراصل۔ میرے بڑے تایا کو ترکھانوں کی ایک لڑکی سے پیار ہو گیا تھا بلکہ دادی تو کہتی ہیں عشق ہو گیا تھا۔ ابھی تک تایا اس کی یاد میں آہیں بھرتے ہیں۔ حالانکہ ایک عدد بیوی اور دو عدد بچے بھی ہیں۔"

"تو تمہارے تایا اس سے شادی کر لیتے" میں نے مفت مشورہ دیا تھا۔

"ہاں، دادی شاید مان ہی جاتیں ان کی حالت دیکھ کر پر مسئلہ یہ تھا کہ وہ لڑکی ساتھ والے گاؤں سے بیاہ کر ہمارے گاؤں میں آئی تھی۔ پورا گاؤں اس کے حسن کی تعریف کر رہا تھا۔ یہ لمبے بال، آنکھیں ایسی جھیلیں کہ نظر اٹھائے تو بندہ ان میں ڈوب جائے۔ قدرت و رنگ نقش سب ہی بے مثل۔ دادی کو بھی شوق چرایا اسے دیکھنے کا تو گھر بلا بھیجا۔ بس غلطی۔۔۔ یہی ہوئی تھی۔ تایا کی نظر اس پر پڑ گئی اور تایا مچل گئے۔ شادی کروں گا تو اسی سے۔ اس کے خاوند کو کہوا سے طلاق دے دے۔ اور یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ بھلا کوئی شوہر اتنا بے غیرت ہو سکتا تھا۔ تو بس دادی بتاتی ہیں انہوں نے چپکے چپکے گھر اور دوسرے سامان کا سودا کیا اور راتوں رات گاؤں چھوڑ دیا۔ تایا بے چاروں کو پتا ہی نہ چلا۔ اس رات وہ کسی دوست کی شادی میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ یوں یہ عشق کامیاب نہ ہو سکا۔"

اور پتا نہیں کیوں اس وقت میرے دل میں خیال آیا تھا کہ اگر ترکھانوں کی وہ لڑکی میں ہوتی اور مجھ سے سائرہ کے تایا نے عشق کیا ہوتا تو میں تو اس عشق کو پانے کے لیے سب کچھ قربان کر دیتی۔ حالانکہ میں اس وقت ساتویں جماعت میں تھی اور اس سے پہلے کوئی ایسا خیال کبھی میرے دل میں نہیں آیا تھا۔

"ہے نا کچھ کچھ فلمی سی کہانی؟"

"ہاں کچھ کچھ۔"

اس نے مجھ سے میرے ابا کے متعلق پوچھا تھا تو میں نے بھی ضروری سمجھا تھا کہ اس سے اس کے ابا کے متعلق پوچھوں۔

"میرے ابا بہت بڑے زمین دار ہیں۔ چک ملوک شاہ میں ہماری بڑی زمینیں ہیں۔ وہ تو ابا، اماں یہاں شہر میں ہماری تعلیم کی خاطر رہ رہے ہیں۔ میرے دادا چوہدری لیاقت حسین کی پورے علاقے میں بڑی دھاک ہے۔"

اس روز ایک اور انہونی ہو گئی۔ میرے لیے تو یہ انہونی ہی تھی۔ میں نے تو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اگلے روز میں اسکول نہیں جا سکوں گی اور پھر بھی سائرہ سے نہیں مل سکوں گی۔

اسکول سے آکر کھانا کھاتے ہوئے میں نے بے بے کو آج کی ساری رپورٹ دی تھی۔ پھر میں نے بے بے اور ابا کو چونکتے دیکھا تھا۔

ابا اس روز کام پر نہیں گیا تھا۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہ تھی اور وہ دھوپ میں چارپائی پر کھیس لیے لیٹا ہوا تھا۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور اب بے بے اور وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور آنکھوں ہی آنکھوں

میں گفتگو بھی کر رہے تھے۔

اس آنکھوں کی گفتگو کا راز اگلی صبح کھلا تھا۔ بے بے نے مجھے اسکول جانے کے لیے اٹھایا نہیں تھا اور جب میں خود ہی اٹھ کر اور یونیفارم پہن کر بے بے کے تخت پر آکر بیٹھی تو بے بے نے کہا۔

"چل جا کر یونیفارم بدل لے۔"

"کیوں بے بے؟" میری آنکھوں میں حیرت تھی۔

"آج سنڈے تو نہیں ہے۔"

"نہ سنڈے نہ منڈے، تجھے اب اسکول نہیں جانا۔"

"پر کیوں بے بے؟"

"زیادہ بک بک نہ کر۔ کہہ دیا کہ نہیں تو نہیں۔" بے بے کے چہرے پر ایسی پتھریلی نہ تھی کہ میں بنا کچھ کہے اٹھ کر ابا کے پاس آگئی، جو تھیلا کھولے اپنے اوزار چیک کر رہا تھا۔

"ابا! بے بے کہتی ہیں کہ مجھے اسکول نہیں جانا کبھی۔"

"بے بے صحیح کہتی ہے پتر۔" بے بے کی ہر بات پر سر جھکا دینے والا ابا بھلا اب کیا اعتراض کر سکتا تھا۔

"لیکن مجھے پڑھنا ہے۔" میں نے پاؤں زور سے زمین پر مارے تھے۔ مجھے اپنے اکلوتے ہونے کا بڑا مان تھا۔

ابا بنا بولے اوزار تھیلے میں رکھ رہا تھا۔ "وہ بسولا کہاں گیا۔ ہاں یہ رہا۔"

"ابا!" میں نے قدرے اونچی آواز میں کہا تھا۔ "آپ میری بات کیوں نہیں سنتے؟"

اسکول میں پڑھنے سے مجھے ادب آداب آگئے تھے اور اب میں اماں ابا کو تو یا تم کہنے کے بجائے آپ کہتی تھی۔

ابا نے بڑی بے بسی سے مجھے دیکھا تھا اور تھیلا اٹھا کر باہر باورچی خانے کے پاس پیڑھی پر بیٹھ گیا تھا اور اماں تھال میں پراٹھا اور سالن کی کٹوری ان کے سامنے رکھ رہی تھی۔

ابا دو نوالے کھا کر کھڑا ہو گیا تھا اور میں اپنے بستر پر گر کر رونے لگی تھی۔ نہ میں نے چائے پی تھی نہ میٹھا پراٹھا کھایا تھا جو اماں نے شاید بے بے کے کہنے پر میرا دل رکھنے کے لیے بنایا تھا۔

پھر دن کا کھانا بھی میں نے نہیں کھایا تھا یونہی روتی رہی تھی۔ پتا نہیں مجھے پڑھنے کا شوق تھا یا نہیں، لیکن مجھے ملکہ سے مقابلہ کرنے کا بہت شوق تھا۔ میں گھر بیٹھ کر اماں کی طرح کروشیے کی بیلیں بناتی رہوں گی اور وہ پڑھ لکھ کر بڑی افسر بن جائے گی۔

یہ بات مجھے زیادہ رُلا رہی تھی اور پھر رات کو ماما بھی آگیا۔ باہر برآمدے میں بے بے کے تخت کے پاس ابا، اماں اور ماما موڑھے بچھا کر بیٹھ گئے تھے۔ بہت دیر تک ہولے ہولے باتیں ہوتی رہی تھیں۔ پھر ماما میرے پاس کمرے میں آیا۔ میرے سر پر پیار کیا اور یقین دلایا تھا کہ میں اگر پڑھنا چاہتی ہوں تو ضرور پڑھوں گی اور وہ مجھے دو تین روز تک کسی اور اسکول میں داخل کروا دے گا۔

"لیکن اس اسکول میں کیوں نہیں ماما؟" رو رو کر میری آنکھیں سوج چکی تھیں اور میری آواز بھاری ہو گئی تھی۔

"کبھی کبھی کوئی بڑی مجبوری آن پڑتی ہے بچی! بس چند دن صبر کر لے میں کسی اچھے اسکول کا پتا کر کے تجھے ادھر داخل کروا دوں گا۔"

اس وقت تو مجھے اس بڑی مجبوری کی سمجھ نہیں آئی تھی لیکن کئی سالوں بعد خود بخود ہی مجھے اس مجبوری کا پتا چل گیا تھا۔ چک ملوک شاہ میں بیاہ کر آنے والی ترکھانوں کی خوبصورت دلہن اماں کے علاوہ بھلا کون ہو سکتی تھی۔ اس لیے تو اماں ابا نے گاؤں چھوڑا تھا اور جب مجھے اس مجبوری کا ادراک ہوا تو میرے اندر دیر تک گدگدی ہوتی رہی تھی اور میرا دل چاہا تھا کہ میں اماں اور ابا سے پوچھوں اور انہیں بتاؤں کہ میں وہ جان گئی ہوں جو انہوں نے کبھی میرے ساتھ شیئر نہیں کیا تھا۔ لیکن میں اب بچی نہ تھی کہ جو جی میں آتا بے دھڑک کہہ دیتی۔ سو بس دل ہی دل میں محظوظ ہوتی رہی۔



ماما نے حسب وعدہ کسی اور اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ یہ بھی اچھا اسکول تھا۔ لیکن مجھے اپنا اسکول چھوڑنے کا بڑا دکھ تھا۔ یہاں میری سائرہ جیسی کوئی سہیلی نہ تھی جسے میرے ساتھ دیکھ کر لڑکیاں رشک کرتیں۔ میں نے اس اسکول میں دسویں تک پڑھا لیکن میرا دل نہیں لگا۔ بس میں اسکول جاتی رہی۔

ماما روز ہی آجاتا تھا اور پھر سب ہولے ہولے باتیں کرتے۔ شاید گھر بیچ کر کہیں اور جانے کی اور ماما انہیں سمجھاتا تھا۔

"اب ایسا بھی اندھیر نہیں مچا ہوا بھائیا جی! اٹھائیس سال گزر گئے اب تو مٹی پڑ گئی ہر بات پر۔"

پھر ابا اور بے بے مان گئے لیکن میں پھر کبھی اس اسکول نہ جا سکی۔ سرٹیفکیٹ لینے بھی ماما ہی گیا تھا۔

میں نے دسویں کا امتحان دیا تو بے بے کو ایک ہی ہڑک لگ گئی۔ میرے بیاہ کی۔

"سن منیر حسین! کوئی رشتہ دیکھ اپنی حاجرہ کے لیے۔"

"ہیں اماں!" پہلی بار ابا نے "حکم کریں بے بے" کے بجائے کچھ اور کہا تھا۔

"ہاں منوں! اپنی حاجرہ کی اب شادی کی عمر ہو گئی ہے۔"

اور ابا پریشان ہو کر اماں کو تکنے لگا تھا۔

آس پاس دور و نزدیک کوئی ایسا نہ تھا۔ ابا کا بھی کوئی بہن بھائی نہ تھا۔ اور اماں کا بڑا بھائی اور بہن ایسے کراچی میں رچ بس گئے تھے کبھی ادھر نہ آئے۔ اماں کے متعلق جان لینے کے باوجود بھی۔

پھر حسب معمول یہ مسئلہ بھی ماما کے سامنے رکھا گیا۔

"ایسی بھی کیا جلدی ہے آپا! پڑھنے دیں اسے۔"

"نہ! تو نے اپنی بیٹی کو کلکٹر بنانا ہے ہم نے نہیں۔" بے بے تو ماما کا منہ ہی بند کر دیا تھا۔

"ٹھیک ہے دیکھوں گا کوئی اچھا رشتہ ہوا تو۔" لیکن ماما کے دیکھنے سے پہلے ہی ایک رشتہ آسمان سے ٹپک پڑا۔ بے بے نے آس پاس محلے پڑوس کی ہر آنے والی خاتون سے، جو کروشیے کی بیلیں بنوانے آتی تھی میرے رشتے کی بات کان میں ڈال رکھی تھی۔ جبکہ میں تو جل جل کر کوئلہ ہو رہی تھی کہ ملکہ تو کالج جا رہی تھی اور میں گھر میں بیٹھ جاؤں۔ رشتہ نہ بھی آتا تو مجھے بے بے کا ارادہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ کالج میں مجھے پڑھائے گی۔

میں سارا دن اپنی چارپائی پر پڑی رہتی تھی۔ اور کلستی رہتی تھی۔ بے بے آوازیں دیتی رہتی اماں اکیلی کام کرتی رہتیں لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوتی۔ مجھے سب پر غصہ تھا۔ ایک بار ملکہ بھی آئی تھی۔ وہ کالج جا کر نکھر گئی۔ اس میں کچھ وقار سا آگیا تھا اور اس نے نظر کا چشمہ لگا لیا تھا۔ اور اس نے بال نئے اسٹائل میں کٹوا لیے تھے، بے بے اس کے کٹے ہوئے بالوں کو دیکھ کر ہمیشہ برے برے منہ بناتی تھی۔

"حاجرہ! تم پریشان نہ ہو میں تمہارے لیے کتابیں لے آؤں گی۔ تمہارا رزلٹ آجائے نا تو پھر تم گھر میں ہی تیاری کر لینا۔ میں تمہاری مدد کر دوں گی۔ بلکہ ہر سنڈے کو کبھی تم میرے گھر آجانا کبھی میں آجاؤں گی تو۔"

"خود تم کالج میں مزے کرو اور میں۔" میں کلس رہی تھی۔ میں نے اس کے خلوص اور محبت کو جاننے کی کوشش نہیں کی۔

خالہ بتول رشتہ لے آئی۔ ہمارے پڑوس میں رہتی تھی۔

"میری پھوپھی کا پتر ہے۔ تھوڑی پکی عمر کا ہے۔ بس شادی میں تاخیر ہو گئی۔ اپنا کماتا ہے۔ یہ بڑی دکان ہے پنساری کی۔ اور گھر بھی اپنا ہے۔ میاں چنوں میں رہتا ہے میری پھوپھی کا پتر۔ پر آج کل میرے پاس آیا ہوا ہے آپ لڑکا یہیں دیکھ لو۔ پسند آجائے تو پھر میاں چنوں جا کر گھر بار دیکھ آنا۔"

بے بے تو جیسے کھل اٹھی تھی۔ اسی وقت چکن کی سفید چادر سر پر رکھ کر گرگابی پہن کر لڑکا دیکھنے چلی گئی۔

"بڑا امیر ہے منیر حسین۔ کہہ رہا تھا دس تولے سونا

چڑھائے گا' مجھے تو لڑکا بہت پسند آیا ہے۔ تو بھی جا کر دیکھ لے۔"

ابا کو لڑکا پسند آیا تھا یا نہیں' لیکن انہوں نے بے بے سے کہا تھا۔

"جو حکم بے بے۔"

"تو بس پھر منہ میٹھا کرا دے بتول اور منڈے کا۔"

اماں نے تھوڑا بہت رولا بھی ڈالا تھا۔

"بے بے! لڑکا کہاں ہے وہ اچھا خاصا مرد ہے اور پھر شکل و صورت بھی۔"

"لو صالحہ!" بے بے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسی تھی۔

"بھلا مرد کی شکل کس نے دیکھی ہے۔ بس آدمی کا بچہ ہونا چاہیے اور تیری دھی (بیٹی) کون سی حوراں پری ہے جو اس کے لیے شہزادہ اترے گا آسمان سے' بس ہاں کر دی ہے میں نے۔"

اور وہ واقعی بس آدمی کا بچہ ہی تھا۔

رات کو بے بے کے بلانے پر وہ گھر آیا تو میں ملکہ کے کندھے پر سر رکھ کر بلک بلک کر روئی۔ اماں نے مامے اور ملکہ کو بھی بلا لیا تھا۔ ملکہ نے کھڑکی کی جھری میں سے مجھے دکھایا تھا۔ پکا کالا رنگ۔ تیل میں چپڑے بال۔ ٹیڑھی مانگ نکالے بوسکی کا کرتا اور لٹھے کی شلوار پہنے منہ میں پان دبائے وہ مجھے زہر ہی لگ رہا تھا۔

ملکہ ترس اور تاسف سے مجھے دیکھتی رہ گئی تھی۔ صبح سے اب تک مجھے تسلی دیتے دیتے اب اس کے الفاظ ہی ختم ہو گئے تھے۔

بے بے نے اس کے ہاتھ پر ایک سو ایک روپیہ رکھ کر بات پکی کر دی تھی۔ باہر برآمدے میں سبز اور سرخ گڈی کاغذوں سے ڈھکے مٹھائی کے دو ٹوکرے پڑے تھے۔ اور اندر میں ملکہ کی گود میں سر رکھے دھواں دھار رو رہی تھی۔

"شادی اگلے ماہ تک کر دیں گے۔" بے بے نے ٹوکروں سے کاغذ ہٹاتے ہوئے فیصلہ سنایا تھا۔

"ایک ماہ میں تیاری کیسے ہو گی؟" اماں منمنائی تھی۔

"چل ایک نہیں دو ماہ کر لے۔ بے چارہ لڑکا اکیلا ہے۔ کھانے پینے کی بڑی تنگی ہے اسے۔ ماں باپ سر پر نہیں۔"

اور لفظ لڑکے نے میرے اندر آگ لگا دی تھی اور میں رو رو کر اس آگ کو بجھانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

✡ ✡ ✡

اماں نے بڑا صندوق کھول کر کپڑے نکال نکال کر انہیں پیک کرنا شروع کر دیا تھا۔ کھیس' بستر کی چادریں' گدے لحاف گنے جا رہے تھے کہ انہونی ہو گئی۔

بتول خالہ روتی دھوتی بے بے کے پاس آئی۔ رو کم رہی تھی۔ واویلا زیادہ ڈال رہی تھی۔

"ہائے میرا گبھرو جوان شیروں جیسا پھوپھی کا پتر' چھت سے گر کر ٹانگ' بازو اور جانے کیا کیا تڑوا بیٹھا ہے۔"

"اللہ کرے سارا ہی ٹوٹ کر ختم ہو جاتا۔" میرے لبوں سے نکلا تھا۔ بے بے نے ابا کو فی الفور میاں چنوں جا کر داماد کی خیریت پوچھنے بھیجا تھا۔ خالہ بتول کا تو منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

"تو بھائی منیر حسین کو کیوں تکلیف دیتی ہیں بے بے!" ہماری لو کھا دیکھی آس پڑوس والے بھی انہیں بے بے کہہ کر بلانے لگے تھے۔

"خوامخواہ کا خرچا اور سفر کی تکلیف الگ۔ اللہ کرے گا بھلا چنگا ہو جائے گا تو خیر نال بارات لے کر آ جائے گا۔"

پر ابا کے لیے تو بے بے کی بات حکم تھی وہ فروٹوں کے ٹوکرے گاڑی میں رکھوا کر چل دیا۔

پر جب واپس آیا تو منہ لٹکا ہوا۔ سر جھکا ہوا۔

بے بے نے بے قراری سے داماد کا حال پوچھا تو ابا کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ انہوں نے کندھے پر رکھے پرنا سے آنسو صاف کیے اور صرف اتنا کہا۔

"بے بے! وہ تو جوان جہان بچوں کا پیو ہے۔ سانڈ کے سانڈ ایسے دیکھتے تھے مجھے جیسے کھا جائیں گے۔



ایک نہ دو پورے پانچ تھے پلٹن کی پلٹن۔ بے بے معاف کر دینا تیری حکم عدولی کی میں نے' پر میں نے وہاں کہہ دیا اس سے کہ بات ختم۔"

اور اماں نے سینے پر دوہتھڑ مارے۔

"ہائے بے بے! میری اکو اک دھی پر کیا ظلم ڈھانے لگی تھی تو۔"

بے بے چپ' شرمندہ سی' تسبیح اٹھا کر دانے گرانے لگی تھی اور میرا دل چاہا کہ میں دھمال ڈالوں۔

سب کپڑے کھیس بستر برتن واپس صندوق میں رکھ دیئے گئے تھے۔ بے بے نے بتول خالہ کو بڑا ہی شرمندہ کیا۔ یہ تو بعد میں پتا چلا تھا کہ شادی پر اس کے پھوپھی کے بیٹے نے اسے سونے کے جھمکے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ میرے دل میں تو بڑی اتھل پتھل مچی تھی کہ میں بھی جا کر افسوس تو کروں کہ خالہ بڑا افسوس ہوا تیرے جھمکے ہاتھ سے گئے۔ اور تب ہی ماما امی اور ملکہ مٹھائی کا ڈبا لیے آ گئے تھے۔ دسویں کا نتیجہ آ گیا تھا اور مجھے پتا بھی نہیں چلا تھا۔ اپنے ہی سوگ میں جو پڑی تھی۔ ملکہ کے پاس میرا رول نمبر تھا اور ماما گزٹ سے نمبر دیکھ کر آئے تھے میں نے اپنے اسکول کی لڑکیوں میں سے سب سے زیادہ نمبر لیے تھے۔ میرے نمبر تو ملکہ سے بھی زیادہ تھے۔

فرسٹ تو ملکہ بھی آئی تھی اپنے اسکول میں' لیکن میرے پورے دس نمبر اس سے زیادہ تھے۔ ملکہ نے خوشی سے مجھے گلے لگا لیا تھا اور جب میں نے رشتہ ٹوٹنے کا اور جھمکوں کا بتایا تھا تو وہ بھاگتی ہوئی باہر گئی اور برقعہ سر پر رکھے ہمارے دروازے سے باہر نکلتی خالہ بتول کو پرسہ دے آئی تھی۔ میرے دل میں تو جیسے ٹھنڈ پڑ گئی تھی۔ میں نے اسے گلے لگا کر چوم لیا۔ وہ میری سچی اور پکی سہیلی تھی اور میں نے اس روز سوچ لیا تھا کہ اب میں کبھی ملکہ سے نہیں جلوں گی۔

یہ ملکہ ہی تو تھی جس سے مقابلے کے شوق میں محنت کرتی تھی میں۔

اور جس نے بے بے سے اتنی بحث کی تھی اور اب بھی اس نے بے بے کو قائل کر لیا تھا کہ مجھے کالج میں ضرور داخل ہونا چاہیے۔ ورنہ قوم کا بڑا نقصان ہو جائے گا اتنی لائق فائق لڑکی اگر پڑھ نہ سکی پھر مجھے اسکالر شپ بھی مل جائے گا تو ابا کو کچھ زیادہ خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔

اور یوں میں اسی کے کالج میں داخل ہو گئی تھی۔

بے بے نے تسلیم کر لیا تھا کہ مجھے یعنی حاجرہ منیر حسین کو بہت سارا پڑھ لینا چاہیے۔ سولہ جماعتیں تو لازمی ہیں۔ بھلے کلکٹر بنے نہ بنے۔ بس سولہ جماعتیں ضرور پڑھ لے۔

بے بے کی طرف سے بے فکر ہو کر میں پڑھائی میں جت گئی تھی۔

ملکہ نے ایف۔ ایس سی میں بورڈ میں پوزیشن لے لی۔ اخبار میں تصویر بھی چھپ گئی اور انٹرویو بھی لگا۔ اور وہ ڈاکٹری پڑھنے کے لیے دوسرے شہر چلی گئی۔

میں اب سیکنڈ ایئر میں تھی۔ اور تھوڑی سمجھ دار بھی ہو گئی تھی۔ میں نے اپنا مضمون میتھس رکھا۔ میں نے پروفیسر بننا تھا۔

ملکہ لاہور جانے سے پہلے مجھے ملنے آئی تھی وہ بہت ہی اداس تھی۔

"کتنا اچھا ہوتا اگر تم بھی میڈیکل میں آتیں تو اگلے سال ہم پھر اکٹھے ہو جاتے۔"

"مجھے ڈاکٹر بننا بالکل پسند نہیں ہے۔"

وہ میرے لیے بڑی فکر مند بھی تھی۔ "اپنا بہت خیال رکھنا۔ یہ جو سہیلیاں ہوتی ہیں نا۔ ان کی ہر بات پر مت یقین کرنا۔ دراصل آج کل کے دور میں کوئی بھی آپ کا مخلص دوست نہیں ہوتا۔ جس کو آپ اپنا بہت اچھا بہت گہرا دوست سمجھتے ہو' وہ بھی اندر سے آپ کا ہمدرد نہیں ہوتا۔ اپنے مفاد کے لیے وہ آپ کو نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔"

"ویسے میں بھی تو تمہاری سہیلی ہوں کیا تم سمجھتی ہو کہ میں بھی ایسی ہوں اپنا فائدہ اور اپنا مطلب؟"

"کیسی باتیں کرتی ہو حاجرہ!" اس نے میری بات کاٹ دی تھی۔ "تم صرف میری سہیلی تو نہیں ہو میری پھوپھی کی بیٹی بھی تو ہو۔ میری پیاری بہن ہو تم۔ میری

اپنی۔"

لیکن یہاں اس کا فلسفہ غلط ہو گیا تھا۔ وہ بھی اور شاید میں بھی نہیں جانتی تھی کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب۔

پھر وہ چلی گئی۔ کالج میں کچھ دن میرا جی بڑا گھبرایا۔ کئی دن ڈری ڈری سی رہی پھر مگن ہو گئی۔ ملکہ نے بہت سی باتیں صحیح کہی تھیں۔ موناعلی حیدر مجھ سے بہت جلتی تھی اور ٹیچرز کے سامنے میرا امیج خراب کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔

ایک بار تو اس نے مسز سعید کے حوالے سے ایک ایسی بات پھیلا دی کہ مسز سعید نے بھری کلاس میں میری بے عزتی کر دی۔ میں نے لاکھ قسمیں کھائیں کہ میں نے ایسی بات کسی سے نہیں کی۔ اور میرے تو فرشتوں کو بھی نہیں پتا لیکن مسز سعید نے میری بات کا یقین ہی نہیں کیا اور پھر آخری دن تک انہوں نے مجھ سے بات نہیں کی۔ مجھے مونا پر بہت غصہ تھا۔ اس لیے کہ مسز سعید میری فیورٹ تھیں اور میں تو ان کے مضمون میں جان توڑ محنت کرتی تھی اور مونا حیدر!

پھر میں نے بھی اس سے بدلہ لے لیا۔ اور ایسا بدلہ لیا کہ پرنسپل تو اسے کالج سے ہی نکالنے والی تھیں۔ پر اس کی ماں نے ان کے پیر پکڑ لیے کہ اس کا سال ضائع چلا جائے گا۔

بس میں نے اتنا کیا تھا کہ جب اسٹاف روم میں کاپیاں رکھی گئیں تو اس کی کاپی میں ایک خط رکھ دیا تھا۔ اس کی رائٹنگ بہت گندی تھی۔ اس کی رائٹنگ کی تین دن تک میں نے پریکٹس کی تھی۔ جبکہ میری رائٹنگ بے انتہا خوبصورت تھی۔ اتنی کہ اپنی کلاس کے چارٹ وغیرہ میں ہی بناتی تھی۔ اس کی رائٹنگ کی نقل کرنا ایسا مشکل نہ تھا۔ وہ خط میں نے اسی کی کاپی سے صفحہ پھاڑ کر لکھا تھا۔ خط کسی سہیلی کی طرف سے لکھا تھا۔ جس میں مس فریدہ اور مس ملک کے متعلق گوہر افشانیاں کی تھیں اور تھوڑا بہت مسز سعید پر بھی تنقید کی تھی۔ کہ مس فریدہ تو خود کو قلوپطرہ سمجھتی ہیں حالانکہ مس ملک تو جب سرخ آئی شیڈ لگا کر آتی ہیں تو بالکل بل بتوڑی لگتی ہیں۔ اور اونچی ہیل کی جوتی پہن کر ایسے چلتی ہیں جیسے مرغی چلتی ہے۔

سارے خط میں ایسی ہی گوہر افشانیاں تھیں اس روز تو اسٹاف روم میں بھونچال آگیا تھا۔ پہلے مونا کو اسٹاف روم میں بلایا گیا پھر ہر پیریڈ میں ہر ٹیچر نے اس کی بے عزتی کی اور میں منہ نیچے کیے ہنستی رہی۔ اس کا رونا اس کی قسمیں ایسی ہی بے اعتبار ٹھہری تھیں جیسی مسز سعید کے سامنے میری۔

اور پھر مس ملک غصے میں وہ خط میڈم کے پاس لے گئی تھیں۔

گھر آکر بھی میں نے خود کو بڑی شاباشی دی۔

اس واقعے کے بعد مجھے پتا چل گیا تھا کہ میرے اندر کہیں کوئی مکار اور کینہ پرور حاجرہ بھی چھپی ہوئی ہے۔ اور میں کسی سے اپنا بدلہ لے سکتی ہوں۔

خیر میں نے بھی ملکہ کی طرح ٹاپ کیا تھا۔ بے بے نے اس روز پورے محلے میں جلیبیاں بانٹی تھیں اور جب دیکھا تھا کہ کالج والوں نے مجھے کوئی سونے وونے کا تمغہ نہیں دیا تو بے لفظوں میں ابا سے کہا تھا۔

"منیر حسین! لڑکی کا بیاہ کب تک کرے گا۔ پڑھ پڑھ کر بوڑھی نہ ہو جائے۔"

"بس بے بے! آپ نے کہا تھا کہ سولہ جماعتیں پڑھے گی تو بس سولہ جماعتیں پڑھ لے تو پڑھی لکھی لڑکیوں کے رشتے بھی اچھے آجاتے ہیں۔"

لیکن اگر ابا میرے لیے رشتہ ڈھونڈ بھی لیتا تو اب میں کچھ نہ کچھ کر ہی لیتی آخر میں نے مونا حیدر جیسی لڑکی کو کالج سے بھگا دیا تھا۔ اس نے بورڈ میں تو کوئی پوزیشن نہ لی تھی لیکن کالج میں تھرڈ آئی تھی لیکن اب چونکہ کسی ٹیچر کی نظر میں اس کی عزت نہیں رہی تھی اس لیے وہ کالج چھوڑ کر کسی اور کالج میں چلی گئی تھی۔ اور مجھے یہ مان دے گئی تھی کہ میں اپنے رستے میں آنے والوں کو ہٹا سکتی ہوں۔ اپنی اس خوبی کا ادراک مجھے پہلے نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

ملکہ لاہور سے میرے لیے بہت سارے گفٹ لائی

تھی۔ اسے میرے ٹاپ کرنے کی بہت خوشی تھی۔ کالج کی کئی باتیں بتائیں مگر مونا حیدر والی بات گول کر گئی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ جان جائے گی کہ وہ خط میں نے ہی لکھا تھا۔

بی۔ اے میں ایک نئی لڑکی روبی میری دوست بن گئی تھی۔ یہ بہت فیشن ایبل تھی۔ اور بہت ہی آزاد گھرانے سے تعلق تھا اس کا۔ ہم دونوں جب فارغ ہو کر بیٹھتے تو وہ مجھے اپنے کزنز کے قصے سناتی۔

"ہائے حاجرہ! تمہیں کیا بتاؤں۔ اشعر تو مجھ پر جان دیتا ہے۔ کہتا ہے تم نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ میری محبت میں پاگل ہوا پھر رہا ہے۔"

اور میں حیرت سے اسے دیکھتی۔ وہ بھی میرے جیسی ہی تھی۔ معمولی سی نقش و نگار والی عام سی لڑکی، سینکڑوں لڑکیوں میں کھڑی ہو تو دکھتی نہیں تھی الگ سے۔ پھر بھی۔

"تو بتا کیا تجھ پر؟"

"نہیں میرا تو کوئی کزن نہیں ہے۔" میں اندر ہی اندر شرمسار ہو جاتی۔ "بس صرف ایک کزن ہے جو ڈاکٹر بن رہی ہے۔"

"ہائے یہ کزن ملکہ کے بجائے مالک ہوتی تو۔" اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

"اچھا اور کسی نے بھی کوئی تحفہ نہیں دیا تجھے۔ تیرے اڑوس پڑوس میں تو کوئی شہزادہ ہو گا نا؟"

"اڑوس پڑوس۔" میں سوچنے لگی تھی۔

"کسی نے کوئی رقعہ کوئی خط؟"

"نہ۔"

میں نے سر نفی میں ہلایا تھا اور اندر ہی اندر جیسے بڑی کمتر ہو گئی تھی۔ اڑوس پڑوس میں لڑکے ہوں گے تو سہی چاہے شہزادے چاہے مراسی، پر میں نے کبھی دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ لیکن دکھ تو یہ تھا کہ مجھ پر بھی کسی نے دھیان نہیں دیا تھا۔

"ہائے تو کتنی نکمی ہے حاجرہ! دھیان دلوانا پڑتا ہے خود کوشش کر کے۔ اب مجھے ہی دیکھ لے کوئی شہزادی نہیں ہوں لیکن محلے کے آدھے سے زیادہ لڑکے مجھ پر مرتے ہیں لیکن میں گھاس نہیں ڈالتی کسی کو۔ سب کے رقعے پرزے پاؤں تلے روند کر چلی جاتی ہوں۔ میں تو بس اشعر۔"

اس نے فخر سے گردن اکڑائی تھی اور اس لمحے سچ مچ مجھے خود پر ترس آیا تھا واقعی میں بڑی نکمی تھی۔ بقول روبی نرے صرف کتابی کیڑا۔

"زندگی صرف کتابوں کے ساتھ نہیں گزرتی میری جان! ایک ساتھی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ چاہنے والا جان فدا کرنے والا' اس لیے کبھی کبھی کتابوں سے ہٹ کر ادھر ادھر بھی دیکھ لیا کر۔"

مجھے اس کی بات سولہ آنے سچ لگی تھی۔ جیسے ابا ہیں اماں کی خاطر گھر بار ڈھور ڈنگر مال سب چھوڑ دیا تھا۔

"مجھے پڑھنے کا شوق تو اپنی کزن کی وجہ سے ہی ہوا ہے۔ ملکہ۔۔۔ ملکہ نام ہے اس کا۔ اسی کالج سے ایف ایس سی کیا تھا اس نے۔"

"وہ جو ڈاکٹر بن رہی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے سر ہلا دیا۔

"تمہاری وہ کزن چینی سی چندھی آنکھوں والی۔ میں ایک بار اپنی کزن کے ساتھ آئی تھی کالج تو دیکھا تھا۔۔۔ ملکہ ہی نام تھا اس کا۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔"

"تو ایسی لڑکیوں کے پاس تو اور کوئی چوائس نہیں ہوتی نا سوائے پڑھنے کے لیکن تم۔" اس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا۔

"تم تو بھئی اچھی خاصی ہو۔ بس تھوڑی سی محنت کی ضرورت ہے۔ اگر تم اپنے لمبے بال کھلے چھوڑ دو۔ سچی کتنے ہی دل تو ان ناگنوں میں الجھ جائیں۔"

وہ ایسی ہی تھی اور ایسی ہی کھلی ڈلی باتیں کرتی تھی اور میں اس کی ہر بات پر ایمان لے آئی تھی۔ پھر بھی میں نے بال تو نہیں کھولے' ہاں مسکارا لگانے لگی تھی۔ کبھی ہلکی سی لپ اسٹک بھی رگڑ لیتی ہونٹوں پہ۔ کبھی کبھی لپ اسٹک انگلی پر لگا کر گالوں پر بھی پھیر دیتی تھی۔ دراصل میں کوشش کرنے لگی تھی کہ دکھنے لگوں اور



اس کوشش میں نڈھال ہوئی جاتی تھی۔ محلے میں قدم رکھتے ادھر ادھر دیکھتی کہ شاید کسی کو دکھ جاؤں' پر ہمارے محلے کے شریف لڑکے آس پاس سے نظریں جھکا کر گزر جاتے تھے۔ پڑھائی کی طرف سے میرا دھیان ہٹ سا گیا تھا اور روبی سے باتیں سننا اچھا لگتا تھا۔ اس کی طرف آنے والے اشعر کے خط پڑھ کر دل میں گدگدی سی ہونے لگتی تھی۔

میرے اندر جیسے کوئی حسرت آکر بیٹھ جاتی اور کُرلانے لگتی۔ دراصل میں فطرتاً ہی جلنے والی تھی اور روبی سے جل رہی تھی۔

✡ ✡ ✡
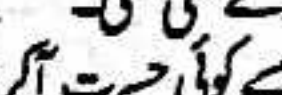
اس روز کالج سے آدھی چھٹی لے کر میں روبی کے گھر گئی تھی۔ روبی نے کہا تھا وہ مجھے اشعر سے ملوائے گی۔ اس کی تصویر اور خط تو وہ کتاب میں اور فائل میں چھپا کر لے آتی تھی' پر پورے کا پورا اشعر تو نہیں لا سکتی تھی اور اشعر کالج کے باہر بھی نہیں کھڑا ہو سکتا تھا کیونکہ اس کی بہن بھی تو اسی کالج میں پڑھتی تھی' سو اس روز میں اس کے ساتھ گھر گئی تھی اس نے جتایا تھا کہ آج اشعر آئے گا پر اشعر تو نہیں آیا تھا اس کا بھائی اطہر آگیا تھا۔ میں اس وقت دروازے کی طرف پیٹھ کیے کھڑی تھی اور روبی میری چوٹی کے بل کھول رہی تھی۔

"یار! آج تیرے ان لمبے بالوں کو کھلا دیکھوں گی اور تجھ سے ان کی لمبائی کا راز بھی پوچھوں گی؟"

اس نے بال کھول دیے تھے۔ وہ گھٹنوں سے نیچے تک آتے میرے بالوں کی تعریف کیے جا رہی تھی، جب اطہر اندر آیا تھا اور پھر انہونی ہو گئی تھی۔۔۔ اطہر تو ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

"اتنے حسین بال۔" اور میں نے جلدی سے بیڈ پر پڑا دوپٹا اٹھا کر اچھی طرح لپیٹ لیا تھا۔

"یہ میرا بھائی ہے اطہر۔"

روبی نے تعارف کروایا تھا اور میرا دل جیسے دگنی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔

"اچھا بھائی اب جائیں۔" اس نے اس طرح دیکھا تھا جیسے مزید دیکھنے کی حسرت ہو۔ تو انہونی یہ ہوئی تھی کہ بقول روبی اس کے بھائی کا دل میری زلفوں میں ہی اٹک کر رہ گیا تھا۔

"بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔"

میں نے کمزور سی آواز میں کہا تھا۔

"کیوں ممکن نہیں میری جان۔۔۔ تو نے نہیں سنا عشق اندھا ہوتا ہے۔۔۔ اور دل کا کیا ہے وہ تو گدھی پر بھی آجاتا ہے۔"

مجھے اس کا گدھی والا محاورہ پسند نہیں آیا تھا' لیکن میں نے لبوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ سجاتے ہوئے اسے مکا مارا تھا۔

"بکو مت۔"

"بک نہیں رہی ہوں۔" اس نے فائل کے کور سے خط نکال کر مجھے دیا تھا۔ خط کیا تھا۔۔۔ پڑھ کر میرے لہو کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ اتنی تعریفیں۔۔۔ اتنے خوب صورت لفظ کہ میں تو دل و جان سے اطہر پر فدا ہو گئی۔ اطہر تو بڑا خوب صورت ہینڈسم لڑکا تھا اور بے بے تے میرے لیے کیا چنا تھا وہ پانچ بچوں کا باپ روبی ہر دوسرے تیسرے روز اس کا خط لاتی اور میں پندرہ پندرہ بار اس کا خط پڑھتی پھر بھی سیر نہ ہوتی۔ روبی تقاضا کرتی جواب کا تو میری ہمت نہ ہوتی لکھنے کی۔

"ہائے کیا لکھوں روبی! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔" میرے پاس ایسے خوب صورت الفاظ نہ تھے اور شعر تو مجھے بالکل نہیں آتے تھے اور اطہر کے خط تو شعروں سے بھرے ہوتے تھے۔ روبی کے گھر دو تین ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ پرڈھکی چھپی سی۔۔۔ گھر میں روبی کی اماں بھی تھیں تو بس۔۔۔ اب اطہر کی ضد تھی کہ کہیں تنہائی میں ملاقات کریں۔ دل تو میرا بھی تڑپتا تھا تنہائی میں ملنے کو' پر مجھے ڈر بھی لگتا تھا۔ فلاں جگہ آجاؤ۔۔۔ وہ لکھتا۔ اچھا وہ جو باغ ہے پرانا' اس میں ملتے ہیں۔۔۔ میں ڈرتی رہی اور پھر انہونی ہو گئی۔۔۔ اللہ نے بچانا تھا نا مجھے۔ میں روبی کو ڈھونڈتی ہوئی کالج کینٹین کی طرف آئی تھی کہ کینٹین کے پیچھے وہ بینچ پر بیٹھی کسی



WWW.PAKSOCIETY.COM

سے باتیں کر رہی تھی۔ شاید اس کی سہیلی تھی کوئی۔

"سنو! تم نے اطہر بھائی کی شادی پر ضرور آنا ہے۔ بارات لاہور جائے گی۔"

اور میرے اندر دھڑام سے کچھ گرا تھا۔ میں نے کانوں کو مسلا۔ کہیں میں نے غلط تو نہیں سنا۔ ابھی کل ہی تو روبی نے مجھے خط دیا تھا اور اطہر نے لکھا تھا۔

"ایک بار تو ملو جانم تاکہ مل بیٹھ کر شادی کا پلان بنا لیں۔ اکلوتا ہوں امی ابو جلد شادی کرنا چاہتے ہیں۔" اور میں روبی کو اسی لیے تو ڈھونڈ رہی تھی کہ اسے بتا سکوں کہ میں شام میں کوئی بہانہ کرکے پرانے باغ میں آجاؤں گی، لیکن یہ کیا ہوا تھا۔ روبی کہہ رہی تھی۔

"یار میرا اکلوتا بھائی ہے ناتو دھوم دھام سے شادی کریں گے۔"

"لیکن تمہاری کزن وہ کیا نام تھا اس کا مونا حیدر... وہ تو ابھی پڑھ رہی ہے نا۔"

"ہاں تو شادی کے بعد بھی پڑھتی رہے گی... دراصل اس کی اماں سخت بیمار ہیں ناتو اس لیے جلدی کرنا پڑ رہی ہے۔"

اور اگر میں دیوار سے ٹیک نہ لگا لیتی تو گر جاتی۔ ساری کہانی میری سمجھ میں آگئی تھی۔ مونا علی حیدر نے اس طرح مجھ سے بدلہ لینا چاہا تھا مجھے بدنام کرکے... ضرور پرانے باغ میں کہیں کوئی جال بچھایا جانا تھا میرے لیے۔ تو یہ تھی تمہاری اوقات حاجرہ منیر حسین! تف ہے تم پر۔

ٹاپر' ذہین' انٹیلی جنٹ۔ کتنی چالاکی سے تم نے مونا سے بدلہ لیا تھا ایسا کہ اس کا پتا ہی کٹ گیا۔ تمہیں تو خود پر بہت ناز تھا' لیکن لوگ تم سے بھی زیادہ "اسمارٹ" ہیں۔

میں لڑکھڑاتی ہوئی وہاں سے واپس مڑی تھی اور چپ چاپ آکر کلاس روم میں بیٹھ گئی تھی۔ آج فزکس کی ٹیچر نہیں آئی تھیں۔ اس لیے کلاس روم میں صرف چند ایک پڑھاکو ٹائپ لڑکیاں کتابیں اور نوٹ بک کھولے بیٹھی تھیں۔ باقی کہیں کینٹین میں' کہیں لان میں دھرنا جمائے بیٹھی ہوں گی۔ میں نے بھی فزکس کی بک نکال کر کھول لی تھی لیکن لفظ میرے آگے بھاگ رہے تھے۔ تب ہی ایک لڑکی اپنی فائل اٹھائے میرے پاس آئی۔

"سنو حاجرہ! یہ نیومریکل تو سمجھا دو۔"

"ہاں بتاؤ کون سا ہے؟"

اور پھر باوجود کوشش کے میں وہ نیومریکل حل نہ کرسکی۔

"سوری! یہ میڈم نے کب سمجھایا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"کل... کیا تم نہیں آئی تھیں۔ یا پھر کلاس میں نہیں تھیں۔ کوئی بتا رہا تھا کہ آج کل تم کلاسیں بہت بنک کرنے لگی ہو۔"

وہ چلی گئی تھی واپس اپنی سیٹ پر اور میں سوچ رہی تھی۔ کل تھی تو میں کلاس میں ہی لیکن میں نے میڈم کا لیکچر کب سنا تھا۔ میں تو فائل کے اندر اطہر کا خط رکھے سارا وقت وہ پڑھتی رہی تھی۔ یہ کتنا بڑا نقصان کرلیا تھا میں نے اور جو شاید کبھی پورا نہیں ہونا تھا۔ اور ملکہ ہر خط میں لکھتی تھی۔ "سنو حاجرہ! اس بار بھی ٹاپ کرنا ہے مجھے تم پر فخر ہے۔"

میں رونا چاہتی تھی دھاڑیں مار مار کر چیخ چیخ کر' لیکن میں یہاں کلاس روم میں بیٹھ کر اپنی یہ خواہش پوری نہیں کرسکتی تھی۔ سو میرے آنسو میرے اندر گر رہے تھے۔ میں نے صرف دھوکا نہیں کھایا تھا۔ میں نے اپنی محبت بھی کھوئی تھی۔ وہ بے شک دھوکا تھا' لیکن میں تو فریبی نہیں تھی اور میں نے تو اطہر سے محبت کی تھی۔ میرے اندر محبت کا ماتم جاری تھا اور میں سر جھکائے فائل پر آڑھی ترچھی لکیریں لگا رہی تھی کہ روبی کلاس روم میں آئی۔

"اللہ... حجو تم یہاں بیٹھی ہو بور لڑکی! آج پھر تمہیں کتابی کیڑا بننے کا شوق چرایا ہے۔"

"ہاں بس ایسے ہی۔" میں نے نگاہیں نہیں اٹھائیں۔ مبادا وہ میری آنکھوں میں غم' دکھ' بے بسی اور نفرت کی تحریر نہ پڑھ لے۔

"سنو..." وہ میرے پاس ہی بیٹھ کر سرگوشیاں کرنے لگی۔

"اطہر بہت بے چین ہو رہا ہے تم سے ملنے کے لیے۔ تمہیں دیکھنے کے لیے... میرے بے چارے بھائی کو مت ترساؤ۔ جو تمہاری ان حسین زلفوں کا قیدی بن گیا ہے۔"

"اچھا۔" میں نے خود کو مضبوط کرتے ہوئے سر اٹھایا۔

"تو کیا کروں تمہارے اس بے چارے بھائی کے لیے؟"

"آج مل لو اس سے۔"

"چلو مل لیتے ہیں تم بھی کیا یاد کرو گی' کس رئیس سے پالا پڑا ہے۔" میں نے زبردستی لہجے کو بشاش بنایا تھا۔

"اللہ... تم کتنی کیوٹ ہو حاجرہ۔"

اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال کر میرے رخسار کو چوم لیا۔ میں نے بے اختیار دائیں ہاتھ سے اپنے رخسار کو صاف کیا۔ میری تو اماں اور بے بے نے بھی کبھی اس طرح پیار نہیں کیا تھا۔ میں کچھ جھینپ گئی تھی اور وہ ہنس رہی تھی۔ خوشی اس کے پورے وجود سے ٹپک رہی تھی یوں جیسے میں نہیں وہ اپنے محبوب سے ملنے جا رہی تھی۔

"تو کب...؟ کیا بتاؤں کب آؤ گی؟"

"تین بجے... تین بجے آؤں گی اماں کو تمہارے گھر کا بتا کر۔"

میں اور کچھ نہیں کرسکتی تھی مگر کم از کم وہ وہاں میرے انتظار میں سڑتا تو رہے گا چند گھنٹے۔

اس تصور سے میرے دل کی جلتی بھنتی زمین پر بارش کے چند چھینٹے پڑ گئے تھے اور گھر آکر میں نے اس خیال سے خود کو محظوظ کرنا چاہا تھا کہ وہ پرانے باغ میں کسی الو کی طرح میرے انتظار میں بیٹھا باغ کے پھول پتے گن رہا ہوگا کیونکہ دن کے تین بجے وہ ستارے گننے سے تو رہا' لیکن میں محظوظ نہیں ہوسکی تھی۔ الٹا میری آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

یہ نوعمری کا پہلا پہلا عشق۔ کیسے کچوکے لگاتا ہے۔ برسوں میرا اندر اس زہر سے نیلا ہوتا رہا۔ میں اگر کلاس روم میں نہیں رو سکتی تھی تو گھر میں بھی دھاڑیں مار مار کر نہیں رو سکتی تھی۔ اس لیے چپکے چپکے روتی رہی۔ تکیہ کبھی منہ پر رکھ لیتی' کبھی منہ تکیے پر اوندھا لیتی۔

☼ ☼ ☼

ابا کام سے واپس آیا تو بے بے نے چائے کے لیے آواز دی۔ چھ بج رہے تھے۔ گرمیوں کے لمبے دن تھے ابا چھ بجے تک آجاتا تھا۔ پتا نہیں وہ اب تک باغ میں بیٹھا ہوگا یا واپس چلا گیا ہوگا۔ میں نے باہر آکر حمام کے پاس بیٹھ کر خوب رگڑ رگڑ کر منہ دھویا اور بے بے کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ ابا موڑھے پر سر جھکائے بیٹھا تھا جیسے بے بے کے حکم کا منتظر ہو۔

"بے بے! سر میں بہت درد ہے۔"

میں نے آنکھیں موندلی تھیں کہ کہیں وہ ان آنکھوں کی سرخی نہ دیکھ لے۔

"مت ماری گئی ہے اس کڑی کی پڑھ پڑھ کے میں کہتی ہوں منیر حسین! اتنا پڑھ کر کیا کرے گی؟" اور اس سے پہلے کہ بے بے پھر سے کوئی رشتہ ڈھونڈنے کی فرمائش کرتی میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"بے بے! میں کالج میں پڑھاؤں گی لیکچرار بنوں گی۔"

ابا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"میری بیٹی ضرور لیکچرار بنے گی۔" ابا کے لہجے کے یقین نے میرے دل پر جیسے پھاہے رکھے تھے۔

"ایک ڈاکٹر بنا رہا ہے بیٹی کو' دوسرا استاد۔ تم سالے بہنوئی نے ویاہ نہیں کرنے اپنی بیٹیوں کے۔"

"شادی بھی اپنے وقت پر ہوجائے گی بے بے! آپ دعا کیا کریں۔ نصیب اچھا ہو۔ پہلے کی طرح جلد بازی نہیں کرنی ہم نے۔"

اماں چائے لے کر آگئی تھیں۔ یوں تو ساس بہو میں بہت پیار تھا' لیکن اماں بھی انہیں "میاں چنوں" والے رشتے کو یاد دلانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں

دیتی تھیں اور یہ واحد بات تھی جس پر بے بے کی بولتی بند ہو جاتی تھی۔

"چل ادھر رکھ سر میں دبا دوں۔"

بے بے نے جیسے اماں کی بات سنی ہی نہ تھی اور میں پھر بے بے کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

"چائے تو پی لے۔"

اماں نے کہا تھا' لیکن میں آنکھیں موندے بے بے کی گود میں سر رکھے بے بے سے دبواتی رہی اور جب چائے پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی تو ایک ہی گھونٹ میں پی کر اپنے کمرے میں آ گئی اور پھر اطہر کے متعلق سوچنے لگی۔

اب تک تو ضرور گھر چلا گیا ہو گا۔ بہت غصہ آیا ہو گا اسے اور روبی بھی ضرور غصہ کرے گی۔ ناراض ہو گی تو ہوا کرے۔ میں رات بھر ٹھیک سے سو نہیں پائی تھی۔ یہ زخم اتنی جلدی بھرنے والا تو نہیں تھا۔ صبح میں روبی کی متوقع ناراضی کے متعلق سوچتی ہوئی ہی کالج گئی تھی اور وہ مجھے منہ پھلائے کالج کے لان میں ہی مل گئی۔

"کیا موت آ گئی تھی تجھے کہ آئی نہیں؟"

"بس نہیں آ سکی سوری۔"

"پتا ہے اس نے کتنا انتظار کیا تمہارا پورے دو گھنٹے۔" اس نے لہجے کو نرم بنانے کی کوشش کی تھی۔

"صرف دو گھنٹے۔" میں کراہی۔

"محبت کرنے والے صدیوں انتظار کرتے ہیں۔ وہ صرف دو گھنٹے میں ہی تھک گیا روبی!"

"کمال کرتی ہو حاجرہ! اور کتنا انتظار کرتا پانچ بجے کے بعد تو نہیں آنا تھا نا تم نے۔ کیا رات بھر وہاں بیٹھا رہتا۔"

"مجھے ایسے بودے عاشق کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے اپنے اوپر چڑھایا تصنع کا لبادہ اتار پھینکا۔

"یہ رہے اس کے محبت نامے۔" میں نے ایک کم بیس محبت ناموں کا پلندہ اس کی طرف بڑھایا۔ اب پتا نہیں میرا ہاتھ لرزا تھا یا کیا کہ پلندہ نیچے گر گیا اور اسے جھک کر اٹھاتے ہوئے الگ ہو جانے والے خط پر میری نظر پڑی۔

"جان من حاجرہ منیر حسین!"

اور میرے اندر کہیں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ بھلا اتنا لمبا چوڑا نام لکھنے کی کیا ضرورت تھی پر تب تو میں خط کے مضمون میں ایسی گم ہو جاتی تھی کہ القاب پر کبھی نظر نہیں پڑی تھی۔ محبت کرنے والے تو چھوٹے چھوٹے منے منے القاب لکھتے ہیں جیسے وہ زبان سے کہتا تھا۔

حجو۔۔۔ حاجی۔۔۔ حجری۔۔۔ حجی۔۔۔

روبی نے ہاتھ بڑھایا تھا اور میں نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

کیسی بے وقوفی کرنے لگی تھی میں۔ کل کو یہ خط میری بدنامی کا سبب بھی بن سکتے تھے۔ بھلے میں نے اس کے کسی خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ لیکن ان خطوط میں جن کی پیشانی پر جان من حاجرہ منیر حسین صاف صاف لکھا تھا کہ کسی شک و شبہے کی گنجائش نہ رہے اور خط کے مضامین تو اور بھی کہانیاں سناتے تھے۔ ملاقات کی اور۔۔۔ اور

"نہیں۔"

میں کراہی تھی' میں اگر آئینہ دیکھ سکتی تو مجھے یقین ہے اتنی کمینی اور اتنی گھٹیا مسکراہٹ زندگی میں پہلی اور آخری بار دیکھتی۔

"یہ تو میں اپنے پاس رکھوں گی تمہارے پیارے مسکین سے اطہر بھائی کی نشانی کے طور پر۔" روبی ہکا بکا منہ پھاڑے کھڑی تھی۔

"یہ تم آج کیسی باتیں کر رہی ہو حاجرہ!" بمشکل تھوک نگلتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"میں تو ایسی ہی باتیں کرتی ہوں سوئٹی! اور ہاں بھائی کی شادی مبارک ہو۔ موٹا حیدر کو بھی میری طرف سے مبارک دینا۔ آخر میری کلاس فیلو تھی وہ پرائی۔" مجھے یقین ہے میری مسکراہٹ میں جو کمینہ پن تھا' وہ اس نے بھی تاڑ لیا ہو گا۔ تب ہی تو وہ چپکی کھڑی تھی۔

"تو۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اب یہ مسکراہٹ میرے ہونٹوں سے غائب ہو گئی تھی، لیکن سارا کمینہ پن میری آنکھوں میں اتر آیا تھا۔

"ہاں اپنے پیارے اور مسکین اطہر بھائی کو کہہ دینا اور اپنی اس راج دلاری بھابی کو بھی کہ زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش نہ کریں۔ بہتر ہو گا کہ آج کے بعد اپنے ذہن سے مجھے کھرچ دیں۔۔۔ ورنہ۔۔۔" میں نے بالکل ڈرامائی انداز میں توقف کیا تھا۔

"ورنہ یہ خط میں مونا بی بی کے والد صاحب کے پاس لے جاؤں گی کہ یہ ہے آپ کا دلارا داماد جو لڑکیوں کو ایسے عشقیہ خطوط لکھتا ہے اور آپ اپنی اکلوتی بیٹی کی زندگی اس جیسے آوارہ کے حوالے کر کے برباد نہ کریں اور مجھے یقین ہے کہ۔۔۔"

میں پھر ڈرامائی انداز میں چپ کر گئی تھی۔ میری نظریں پیلی پڑتی روبی پر تھیں۔ مونا کے والد بہت مذہبی اور بہت سخت قسم کے تھے اور یہ بات مونا کی امی نے اس وقت پرنسپل کو بتائی تھی جب پرنسپل نے اسے بلایا تھا۔ وہ اگر اس معمولی بات پر اتنا ڈر رہی تھی تو یہ تو بہت بڑی بات تھی۔ میں نے محض تکا لگایا تھا جو ٹھیک نشانے پر بیٹھا تھا۔ روبی ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ منتیں کر رہی تھی۔

"پلیز حاجرہ! تم ایسا کچھ مت کرنا۔ تمہیں اللہ کا واسطہ۔ مونا میرے بھائی کی بچپن کی منگیتر ہے۔ بھائی اس سے بہت محبت کرتے ہیں اور خالو وہ تو۔۔۔ وہ تو بہت سخت ہیں۔ اخلاقی اقدار کو بہت اہمیت دینے والے وہ۔"

"اچھا لیکن کل تک تم کہہ رہی تھیں کہ تمہارا بھائی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ مجھے اپنا بنانے کے لیے مرا جا رہا ہے؟"

"پلیز! جھوٹ تھا وہ سب، بکواس کی تھی میں نے۔" اب وہ رو رہی تھی۔

"وہ تو تم نے مونا کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اور مونا نے مجھے اور بھائی کو بتایا تھا۔"

"میں نے مونا کے ساتھ کچھ نہیں کیا تھا بلکہ مونا نے مجھے ٹیچرز کی نظروں سے گرانے کے لیے جو کچھ کیا تھا، وہ اس کا نتیجہ تھا۔ بعض اوقات آدمی اپنے ہی کھودے ہوئے گڑھے میں گر جاتا ہے۔" میں ایسی بات کا اعتراف کیوں کرتی جسے میرے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا تھا میں نے تمسخر سے اسے دیکھا۔

"تمہارا ڈراما فلاپ ہو گیا ہے۔ اب دوبارہ ایسا ڈراما کرنے کی کوشش نہ کرنا۔" اسے وہیں چھوڑ کر میں کلاس روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔ خود کو میں نے بہت شاباش دی تھی کیا غضب کی اداکاری تھی میری یعنی میں حاجرہ منیر حسین ایک اداکارہ بھی بن سکتی ہوں۔

اس روز میں گھر آ کر خوب ہنسی تھی۔ اتنا کہ ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور پھر یہ آنسو کتنی ہی دیر تک بہتے رہے تھے بلکہ کتنے دنوں تک۔۔۔ کتاب سامنے رکھتی تو لفظ دھندلا جاتے اور آنکھیں پانیوں سے بھر جاتیں۔ کیا تھا جو۔۔۔ جو ان خطوط میں لکھا گیا تھا سچ ہوتا۔۔۔ خط جلاتے ہوئے میں نے کوئی ایک سو دس بار سوچا تھا اور ملکہ کتنا صحیح کہتی تھی کہ آج کل کے دور میں کوئی بھی تمہارا مخلص دوست نہیں بن سکتا۔ اپنے فائدے کے لیے وہ تمہیں گڑھے میں دھکا دے دے گا اور اسے افسوس بھی نہیں ہو گا۔

میں نے سوچا تھا یہ واقعہ میری پوری زندگی کے لیے ایک سبق ہو گا۔ لیکن یہ سبق سیکھنے میں میری کتنی توانائیاں خرچ ہو گئی تھیں یہ صرف میں ہی جانتی تھی۔ میری کلاس میں پہلے بھی کم ہی سہیلیاں تھیں۔ اب تو میں نے کسی سے بھی بات کرنا چھوڑ دیا تھا اور بظاہر میں کتابی کیڑا بن گئی تھی۔ لیکن کیا میں واقعی کتابی کیڑا تھی۔ کھلی ہوئی کتاب کے لفظ تو محبت بھرے لفظوں میں ڈھل جاتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ میں ٹاپ نہیں کر سکی تھی۔ میرے نمبر اچھے تھے میں اپنی کلاس بلکہ اپنے کالج میں تو فرسٹ ہی تھی، لیکن ٹاپ۔۔۔ ہائے ملکہ کو کتنا افسوس ہو گا میں نے رزلٹ دیکھ کر سوچا تھا۔

بلکہ مجھے تو پہلے سے پتا تھا کہ میرا رزلٹ ایسا ہی ہو گا بلکہ اس سے بھی کم نمبروں کی توقع تھی مجھے، لیکن ملکہ اور ماما تو مجھ سے بہت امید لگائے ہوئے تھے۔ ملکہ آئی تھی پہلے کی طرح تحفوں سے لدی پھندی اور مٹھائی کے ساتھ۔ اسے دیکھ کر جانے کب کب کے چھپائے ہوئے آنسو بہہ نکلے تھے۔

"ارے جھلی نہ ہو تو۔" ماما نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

"وہ ٹاپ۔" مجھے اپنے بہتے آنسوؤں کا کچھ تو جواز دینا تھا۔

"تو کیا ہوا اتنے اچھے نمبر ہیں۔" ماما اور ملکہ نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی تھی۔ میرے بہتے آنسو رک گئے تھے۔

"وہ میں بیمار تھی۔ میرے سر میں درد رہنے لگا تھا۔ پڑھ ہی نہیں سکتی تھی۔ بس بغیر پڑھے ہی پیپر دے دیے تھے۔" میں نے سچ اور جھوٹ ملا کر بتاتے ہوئے اپنا چہرہ دوپٹے کے پلو سے پونچھا۔

"اب کیا ارادے ہیں۔" میرے سامنے بیٹھتے ہوئے ملکہ نے پوچھا تھا۔

"ظاہر ہے ماسٹر کروں گی فزکس یا کیمسٹری میں۔"

"ٹھیک ہے تم مجھے اپنے کاغذات دے دینا۔ میں وہاں جا کر اپلائی کر دوں گی۔"

✡ ✡ ✡

پنجاب یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے میں بے بے اور اماں کو روتا چھوڑ کر ماما کے ساتھ لاہور آ گئی تھی۔ دو دن ملکہ میرے ساتھ یونیورسٹی آئی تھی اور ہاسٹل کے کمرے میں میرا سامان سیٹ کرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

"صرف سر درد کا مسئلہ تھا حجو (پیار سے وہ مجھے حجو ہی بلاتی تھی) یا کوئی اور بات بھی تھی۔"

اس کی ان زیرک نظروں سے مجھے خوف آتا تھا پتا نہیں اس کی چندھی آنکھوں میں کوئی ایکسرے مشین فٹ تھی کہ اندر تک دیکھ آتی تھیں۔

"نہیں تو بھلا کیا بات ہونی ہے بس ایسے ہی وہم ہو گیا تھا مجھے۔"

میں نے الماری میں اپنا سامان رکھ کر تالا لگایا تھا اور اپنے بستر پر بیٹھ گئی تھی۔ میری روم میٹ باہر گئی ہوئی تھی۔

"کیسا وہم؟" ملکہ پریشان ہو گئی تھی۔

"وہ سر میں درد ہوتا تھا نا تو میں نے سمجھا سر میں کوئی رسولی۔۔۔" میرے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے تھے۔

"پاگل ہو گئی ہے۔" میں نے اس کے سارے زیرک پن کو شکست دے دی تھی اور وہ مجھے ڈاکٹروں کے پاس لیے لیے پھری۔ وہ خود اب میڈیکل کے چوتھے سال میں تھی۔ کئی دن پریشان رہ کر ایک دن وہ ہنستی ہوئی میرے پاس آئی تھی۔

"یار! کچھ نہیں ہے تمہیں۔ وہم تھا سب۔ سب ٹیسٹ کلیئر ہیں۔ تم نے سر پر سوار کر لیا تھا کہ تمہیں ٹاپ کرنا ہے۔ خیر اب آرام سے سکون سے پڑھو اور سر پر سوار مت کرنا کچھ۔"

اور میں پڑھائی میں جت گئی۔ میں نے کیمسٹری میں ایڈمیشن لیا تھا اور میری روم میٹ نے فزکس میں سو ہمارے درمیان زیادہ دوستی نہ ہو سکی تھی بس رسمی سا تعلق تھا وہ صرف سونے کے لیے کمرے میں آتی تھی مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ مجھے اب کسی کو دوست نہیں بنانا تھا۔

میں اب یونیورسٹی میں تھی۔ تیسرے فیز میں۔ پہلا اسکول تھا۔ دوسرا کالج اور اب یونیورسٹی۔ تینوں فیز میں میں ایک نئی دنیا سے روشناس ہوئی تھی۔ یہاں بہت اعلا تعلیم یافتہ استاد تھے اور مجھے ان سے پڑھ کر مزا آتا تھا میرے ڈپارٹمنٹ میں صرف سات لڑکیاں تھیں۔

لڑکے مہذب تھے۔ دور دور سے لڑکیوں کو دیکھتے تھے۔ نگاہیں جھکا کر بات کرتے تھے۔ پتا نہیں یہ صرف میرے ڈپارٹمنٹ کی بات تھی یا سب ہی ایسے تھے۔ عزت سے بات کرتے تھے۔ اندر اندر پسندیدگیاں بھی چلتی ہوں گی، لیکن میں تو بس اپنی پڑھائی میں ہی مگن تھی۔ مجھے اس بار ضرور ٹاپ کرنا تھا۔

ہولے ہولے میں پہلی محبت کا غم بھول گئی تھی۔

ملکہ کبھی کبھی دس پندرہ دن بعد مجھے ضرور ملنے آتی تھی حالانکہ اس کی پڑھائی بہت ٹف تھی اور اسے محنت بھی بہت کرنا پڑتی تھی، لیکن اسے میرا خیال رہتا تھا ہمیشہ۔ ایک دوبار وہ مجھے اپنے ہاسٹل بھی لے گئی تھی اور بڑے فخر سے متعارف کروایا تھا۔

"یہ میری کزن ہے۔ ایف ایس سی میں ٹاپ کیا تھا اس نے۔" وہ مجھ سے اتنی محبت کرتی تھی، لیکن پتا نہیں میں اس سے اتنی محبت کرتی تھی یا نہیں۔ اس کا جواب مجھے دو سال بعد ملا تھا۔

☆ ☆ ☆

نہیں میں اس سے اتنی کیا سرے سے محبت ہی نہیں کرتی تھی۔ وہ جو بچپن میں میرے اندر اس کے لیے جلاپا پیدا ہوا تھا، وہ اسی طرح میرے اندر کہیں تہہ میں سویا پڑا تھا۔ مرا نہیں تھا۔

میں اب یونیورسٹی میں دکھنے لگی تھی۔ اپنی شکل و صورت کی وجہ سے نہیں، وہ تو اب بھی ایسی ہی تھی معمولی سی لڑکیوں کے ہجوم میں الگ سے نہ دکھنے والی۔ سادہ سے شلوار قمیص پر بڑا سا سفید دوپٹا اوڑھے اور گھنے بالوں کی موٹی سی چٹیا بنائے اور پاؤں میں کالے بند جوتے پہننے والی۔

میں اپنی ظاہری صورت کی وجہ سے نظر نہیں آتی تھی بلکہ اپنے رزلٹ کی وجہ سے۔ اپنے ان اسائمنٹس کی وجہ سے، جن کی تعریف کلاس میں میرے اساتذہ کرتے تھے۔

اساتذہ کی ستائش بھری نظروں نے ہولے ہولے میرے زخم بھر دیے تھے اور میں اب سر اٹھا کر چلتی تھی اور اعتماد سے بات کرتی تھی۔

میرے فائنل ایگزام سے تقریباً" ایک ڈیڑھ ماہ پہلے ملکہ آئی تھی۔

"چل آج موج میلہ کرتے ہیں۔" اس کے بھی فائنل ہفتے بھر بعد اسٹارٹ ہونے تھے جبکہ میرے پیپرز میں ابھی ڈیڑھ ماہ تھا۔ میں تیار ہوگئی۔ انار کلی سے چاٹ کھا کر اور بوتل پی کر ہم مال پر آئے اور مال پر ہمیں وہ ملا تھا۔

"یہ عبدالخالق ہے میرا کلاس فیلو۔"

اس کا نام تو تھوڑا دقیانوسی تھا، لیکن وہ خود بالکل بھی دقیانوسی نہیں تھا کیمل کلر کا کوٹ اور سیاہ ڈریسنگ پینٹ میں وہ بہت شاندار لگ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بلا کی چمک اور مقناطیسیت تھی۔ ہلکا سانولا رنگ۔ دلکش مسکراہٹ لیے وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔

"اچھا تو یہ ہیں آپ کی وہ لائق فائق کزن۔"

"ہاں۔" ملکہ کی آنکھوں میں میرے لیے فخر تھا۔

"اور یہ اب بھی ٹاپ کرے گی۔ ہیں نا۔"

"ہاں۔" میں نے صرف سر ہلایا تھا۔ میں جیسے مسحور سی ہوگئی تھی۔ پتا نہیں اس کی مسکراہٹ نے مجھے مسحور کیا تھا یا اس کے قد اور دلکش مسکراہٹ نے اس کی سانولی رنگت میں بلا کی کشش تھی۔ ایک بار کسی نے کہا تھا کہ مرد تو بس سانولے رنگ کے ہی اچھے لگتے ہیں۔ مردوں کا رنگ اگر چٹا ہو تو بالکل اچھا نہیں لگتا۔

اور آج وہاں مال پر کھڑے کھڑے میں نے سوچا تھا 'وہ بات جس نے بھی کہی تھی۔ بالکل سچ کہی تھی۔ میرا دل تو جیسے پھڑک کر اس کے قدموں میں گر گیا تھا۔ لیکن میں نے اپنی نظریں جھکالی تھیں اور اپنے تئیں اس کے قدموں میں گرے اپنے دل کو اٹھا کر سنبھال لیا تھا۔ کہ کہاں میں منیر حسین ترکھان کی معمولی شکل والی بیٹی اور کہاں وہ جو دیکھنے میں ہی کسی اونچے خاندان کا لگتا تھا۔

اس روز اس نے اپنی گاڑی پر پہلے مجھے اور پھر شاید ملکہ کو اس کے اسپتال چھوڑا تھا۔ میں اس کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھی۔ لیکن میں دوسرے روز ہی ملکہ کے پاس جا کر اس پر اندر کا حال ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پھر بھی پانچویں دن میرے صبر کی حد ختم ہوگئی تھی۔ اور میں اس کے اسپتال پہنچ گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"ہاں خیریت ہے۔ میں نے سوچا دو چار دن بعد تم مصروف ہو جاؤ گی اور پھر چلی جاؤ گی تو مل آؤں۔"

"ہاں لیکن میں پھر آجاؤں گی جلدی ہاؤس جاب کے لیے ڈاکٹر آفندی نے کہا ہے کہ جلد ہاؤس جاب مل جائے گا۔"

"وہ لڑکا۔ وہی جو اس روز مال پر ملا تھا، وہ بھی تمہارے ساتھ پڑھتا ہے؟"

"ہاں بتایا تو تھا اس دن تمہارا دماغ کہاں تھا؟"

ملکہ نے حیرت سے مجھے دیکھا تھا۔

"وہ ہاں خیال ہی نہیں رہا۔ کافی امیر آدمی لگتا ہے اس کے باپ نے کوئی مل وِل لگا رکھی ہوگی۔" میں نے بڑے لاپروا سے انداز میں کہا تھا لیکن ملکہ چونکی تھی۔

"پتا نہیں۔ میں نے کبھی پوچھا نہیں۔ ویسے کیا تم صرف یہ معلوم کرنے کے لیے میرے پاس آئی ہو؟"

اس کی چندھی آنکھوں میں شرارت تھی۔ میں شرمندہ ہوگئی۔

"نہیں یار! بس یونہی آگئی تھی تمہیں ملنے اور وش کرنے۔ گڈ لک۔"

"تھینک یو حاجرہ۔"

"میں اب چلتی ہوں۔"

مجھے پتا تھا یہ وقت اس کے لیے کتنا قیمتی ہے۔ اس نے بھی رکنے کا اصرار نہیں کیا تھا اور میں واپس ہاسٹل آگئی تھی۔ پھر میں نے شعوری کوشش سے اس کا خیال ذہن سے نکالا اور پڑھائی میں مصروف ہوگئی تھی۔ پھر تقریباً" ایک ماہ بعد ملکہ مجھ سے ملنے آئی تھی اور وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ عبدالخالق بھی تھا۔

"کیا آج بھی راستے میں مل گئے تھے آپ۔" بے اختیار میرے لبوں سے نکلا تھا۔

"نہیں۔" وہ ہنسا تھا۔

"آج ہم باقاعدہ پلان کر کے آئے ہیں۔ کالج سے اکٹھے۔ آپ کو وش کرنا تھا۔ آپ کے پیپر کب شروع ہو رہے ہیں؟"

"اگلے ہفتے۔"

"تو آج تھوڑی سی عیاشی کی جا سکتی ہے نا؟" اس نے ملکہ سے پوچھا تھا اور ملکہ نے مجھ سے میں نے سر ہلا دیا تھا۔ وہ میرے لیے الگ الگ وش کارڈ اور پھول لائے تھے۔

ان کے پیپرز ختم ہوگئے تھے اور ملکہ دو دن بعد واپس گھر جا رہی تھی۔ وہ دن میری زندگی کا سب سے خوبصورت دن تھا۔

ملکہ کو ایک بار بھی میں نے عبدالخالق کی طرف دیکھتے نہیں پایا تھا۔ اس کے انداز میں بڑی بے نیازی تھی۔ ایسی بے نیازی جو اٹریکٹ کرتی تھی۔ اس نے جو گرز پہن رکھے تھے اور چھوٹے چھوٹے پھولوں والی مردانہ کالر والی شرٹ تھی اور لمبی آستینوں کے کف تھوڑے سے موڑ رکھے تھے اور اس کی بائیں کلائی پر بندھی چھوٹے ڈائل والی گھڑی میں جڑے ننھے سے نقلی ہیرے اور اس کا گولڈن ڈائل کبھی کبھی جب وہ بائیں ہاتھ سے ماتھے پر آجانے والے بال پیچھے کرتی تو اپنی طرف متوجہ کرتے تھے۔ وہ جب ہنستی تو ہنستے ہوئے اس کے چھوٹے چھوٹے ہموار دانت بھی خوبصورت لگ رہے تھے۔ میں آج پہلی بار اس کی کچھ خوبصورتیوں کا اعتراف کر رہی تھی۔ اور چور نظروں سے عبدالخالق کو دیکھتی تھی۔ حالانکہ جانتی تھی کہ وہ ایسا دور دراز جزیرہ ہے جس پر میں نے کبھی قدم نہیں رکھنا۔ اور یہ شاید آخری ملاقات ہے۔

اس کا ارادہ باہر جا کر اسپیشلائزیشن کرنے کا تھا۔ اور وہ ملکہ کو بھی قائل کر رہا تھا کہ اسے بھی ضرور اسپیشلائزیشن کے لیے باہر جانا چاہیے۔ ان کی باتوں میں مجھے دلچسپی نہ تھی لیکن میرے دل نے خواہش ضرور کی تھی کہ یہ باتیں ختم نہ ہوں اور وہ میرے سامنے بیٹھا رہے۔ مجھے ہاسٹل کے گیٹ پر ڈراپ کرتے ہوئے عبدالخالق نے کہا تھا۔

"حاجرہ کی ٹریٹ پکی ہے آپ کی طرف؟"

"کیسی ٹریٹ؟" میں نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"آپ کے ٹاپ کرنے کی۔"

محنت تو میں پہلے بھی بہت کر رہی تھی لیکن اب اور زیادہ کر رہی تھی۔

پھر میرے پیپرز ختم ہوگئے۔ ماما تے مجھے لینے آنا

تھا۔

میں اس روز پیکنگ کر رہی تھی کہ ایک لڑکی نے آ کر بتایا۔

"آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔ شاید گھر سے لینے آیا ہے۔"

ماما نے تو پرسوں آنا تھا۔ میں نے سوچتے ہوئے بیڈ پر پڑا۔ دوپٹا اٹھا کر سر پر جما لیا۔ میں کچھ دیر پہلے ہی باتھ لے کر نکلی تھی اور میرے گھٹنوں تک چھوتے لمبے اور گھنے بال کھلے تھے۔ تھوڑے گیلے تھوڑے خشک۔

"اللہ خیر کرے بے بے کو کچھ نہ ہو گیا ہو۔ میں دل میں آنے والے وسوسے کو جھٹکتی وزیٹنگ روم میں آئی تو وہاں عبدالخالق کو بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ "آپ؟"

"ہاں" وہ مسکرایا تھا۔

"کیسے ہوئے پیپرز؟"

"بہت اچھے۔" دل میں حیران ہوتی ہوئی میں بیٹھ گئی تھی۔

"یعنی ٹریٹ پکی" وہ ہنسا۔

"ہاں پکی۔"

"گڈ"

"مجھے ڈر تھا کہ کہیں آپ چلی نہ گئی ہوں۔"

"نہیں آج ہی تو آخری پیپر دیا ہے پھر اتنی تھکن ہے۔ کچھ شاپنگ بھی کرنی ہے۔ پیکنگ کرنی ہے۔ ماموں پرسوں لینے آئیں گے۔"

"ماموں یعنی ملکہ کے ابو۔"

میں نے سر ہلا دیا لیکن اس وقت مجھے اس کے منہ سے ملکہ کا نام سننا بہت ناگوار گزرا' پتا نہیں کیوں۔

"ذہانت مجھے اٹریکٹ کرتی ہے۔" وہ دھیمے دھیمے کہہ رہا تھا۔

"ظاہری خوبصورتی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اصل انسان کے اندر کا حسن ہوتا ہے۔ ظاہری حسن ادھر ادھر بہت بکھرا ہوا ہے لیکن اندر کا حسن کم کم نظر آتا ہے۔ ہمارے آس پاس ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جن کے من میلے ہیں۔"

میرے اندر جیسے خوش گمانی کے پہاڑ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"اور ملکہ ایسی ہی لڑکی ہے۔ ذہین' سادہ بے غرض' بے ریا۔"

اور سارے پہاڑ دھم سے گر گئے تھے اور میرا وجود جیسے ان کے نیچے دب کر چور چور ہو گیا تھا۔

"میں نے برسوں اسے پرکھا ہے۔ اس کے دل میں کبھی کھوٹ نہیں پایا۔ نہ لالچ' نہ ہوس اپنے آپ میں مگن وہ ایسی اللہ لوک لڑکی ہے کہ اسے آج تک یہ خبر نہیں ہو سکی کہ میں اس کے لیے اپنے دل میں کیا جذبات رکھتا ہوں اور مجھے اس کی یہ بے خبری بھی اٹریکٹ کرتی ہے۔"

میں پتا نہیں اپنی آنکھوں میں اترتی دھول چھپانے کے لیے جھکی تھی یا یہ کوئی شعوری حرکت تھی کہ جھکنے سے میرا دوپٹا ڈھلک گیا تھا اور میرے کھلے بال میرے شانوں پر اکھٹے ہو کر زمین کو چھونے لگے تھے۔ جب میں سیدھی ہوئی تھی تو میں نے اس کی آنکھوں میں ستائش دیکھی تھی۔ لیکن پھر فوراً" ہی اس نے نظریں ہٹالی تھیں۔

میں نے دوپٹا اچھی طرح لپیٹ کر خواہ مخواہ ہی وضاحت کی تھی۔

"وہ میں ابھی باتھ لے کر نکلی تھی۔ بال خشک نہیں ہوئے تھے تو آپ آ گئے اور ایسے ہی بال باندھے بغیر چلی آئی۔"

وہ صرف مسکرا دیا تھا۔

"وہاں کالج میں ایسی لڑکیاں بھی تھیں' جو لڑکوں کو متوجہ کرنے کے لیے طرح طرح کی اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتی تھیں لیکن ملکہ نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ حالانکہ کچھ لڑکے تو اس کے ارد گرد چکراتے رہتے تھے۔ اس سے نوٹس لینے کے چکر میں۔ میں نے کبھی ملکہ سے کچھ نہیں کہا کہ میں اس کے متعلق کیا سوچتا ہوں۔"

"کاش! تم مجھ سے کبھی یہ نہ کہتے تو میں بہت آرام و سکون سے یہ سوچ کر خوش رہنے کی کوشش کرتی کہ ایسے لڑکے بھلا ہم جیسی لڑکیوں... لیکن اب تو اس نے مجھ جیسی ہی ایک لڑکی کو پسند کر لیا تھا اور یہ

تکلیف وہ بات تھی کہ وہ لڑکی میں نہیں تھی۔

"میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ آپ میری آرزو اس تک پہنچا دیں۔ اسے اگر اعتراض نہ ہو تو میں اپنے والدین کو اس کے گھر بھیجوں گا۔"

"نہیں۔" میرے حلق سے گھٹا گھٹا سا نکلا تھا۔

"وہ۔ وہ تو شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اس نے مجھے ایک دفعہ کہا تھا کہ وہ شادی نہیں کرے گی اور اپنے امی ابو کا بیٹا بن کر رہے گی۔"

"ایسی باتیں عموماً" اکلوتی لڑکیاں کرتی ہیں۔ یہ ان کی اپنے والدین کے لیے محبت کی انتہا ہوتی ہے لیکن ایسے فیصلوں پر قائم رہنا ممکن نہیں ہوتا حاجرہ!"

اس کے لبوں سے میرا نام نکلا تھا جیسے ہر طرف مٹھاس گھل گئی تھی۔ میرا جی چاہنے لگا وہ بار بار میرا نام لے۔

"آپ کے گھر میں فون ہے؟" میں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"تو یہ میرا نمبر رکھ لیں اور ملکہ سے بات کر کے مجھے فون کر دیجیے گا۔"

"آپ کے والدین مان جائیں گے؟"

"میرے والدین دنیا کے سب سے انوکھے والدین ہیں۔ کبھی آپ سے ملواؤں گا۔" وہ مسکرایا تھا۔

"ہمارے خاندان میں خوبصورت لڑکیوں کی کمی نہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی ملکہ جیسی نہیں ہے۔"

ملکہ کے لیے محبت اس کی آنکھوں سے اور اس کے لہجے سے جھلکتی تھی اور میرا اندر جل کر کباب ہو رہا تھا۔

"لیکن ملکہ کے ابو۔ آپ ہمارے خاندان کے متعلق تو کچھ نہیں جانتے۔"

"میں نے ملکہ کو جان لیا۔ آپ کو دیکھ لیا۔ مجھے کسی اور کے متعلق جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بھلے خاک کے فرش پر سوتے ہوں اور جھونپڑے میں رہتے ہوں لیکن میں جانتا ہوں ان کے من سچے موتیوں جیسے ہوں گے کہ زمرد ہمیشہ مونگے کی چٹان پر اگتے ہیں۔"

کیا عجیب آدمی تھا وہ "اس دور میں کیا پسند کر رہا تھا۔

وہ نمبر دے کر چلا گیا تھا اور میں ساکت بیٹھی تھی۔

اسے ذہانت اٹریکٹ کرتی تھی تو پھر ملکہ ہی کیوں۔ میں کیوں نہیں۔ میں تو اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوش شکل تھی۔ کم از کم اس سے زیادہ لیکن وہ تو مجھ سے صرف دو بار ملا تھا اور آج تیسری بار۔ اور ملکہ کے ساتھ کئی سالوں سے پڑھ رہا تھا۔

مجھے بہت رونا آیا۔ بہت سارے دنوں بعد پرانے زخموں کے ٹانکے بھی کھل گئے تھے شاید ورنہ عبدالخالق سے میرا کیا ناتا تھا۔ کیسی انہونی سی تھی تاکہ ترکھانوں کی کم صورت لڑکی عبدالخالق کے دل کو بھا گئی تھی۔

میں نے پتا نہیں سامان کی کیسے پیکنگ کی تھی۔ اور بستر پر گر گئی تھی۔ اور اپنی روم میٹ سے کہہ دیا تھا کہ جب وہ بازار جائے تو اماں اور بے بے کے لئے دو شالیں لے آئے اور ابا کے لیے بھی ایک سستی سی گھڑی۔ خود میں سستی سے پڑی رہی تھی کہ ملنا لینے آگیا۔ میرا موڈ بہت خراب تھا۔ نہ میں نے بے بے سے اچھی طرح بات کی تھی نہ اماں اور ابا سے اور تھکن کا بہانہ کر کے چادر سر تک تان کر کمرے میں آ کر لیٹ گئی تھی۔ جب ملکہ مجھے ملنے آئی تو میں نے اس سے بھی اچھی طرح بات نہیں کی۔ اور نہ ہی عبدالخالق کا اسے بتایا بس سردرد کا بہانہ بنا لیا۔ چہرے پر بھی نقاہت طاری کر لی اور وہ بے بے اور اماں کے پاس بیٹھ کر اور مجھے آرام کی تلقین کر کے چلی گئی۔ دو تین دن تک میں یونہی زیادہ وقت کمرے میں چارپائی پر لیٹی رہی پھر ایک دن میں اس کا دیا ہوا نمبر لے کر اسے فون کرنے چلی گئی۔

"ہیلو! یہ آپ ہیں نا حاجرہ!" اس نے بڑی بے تابی سے پوچھا تھا۔

کاش یہ بیتابی میرے لیے ہوتی۔

"جی وہ میں نے بات کی تھی ملکہ سے 'وہ بالکل بھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

میں فراٹے سے جھوٹ بول رہی تھی۔ ذہین تو میں



تھی اور اداکاری میں بھی مجھے کمال حاصل تھا۔ وہ بے حد افسردہ سا تھا۔ میں نے خود ہی اپنی اداکاری پر داد دی اور خراماں خراماں گھر کی طرف چل پڑی۔ میرے اندر چھپی "سڑادی" لڑکی باہر آگئی تھی۔

میں نے عبدالخالق سے وعدہ کیا تھا کہ میں سمجھاؤں گی ملکہ کو کہ وہ یہ بیوقوفی نہ کرے۔ مجھے ایسا من کی خوبصورتی کا قدر دان ملتا تو میں اس کے پاؤں دھو دھو کر پیتی۔

میں نے ساتھ ہی پانسہ بھی پھینک دیا تھا۔

"ملکہ کی سوچ بہت خوبصورت ہے حاجرہ! اس کے دل کی طرح۔ آپ اس سے کہئے گا میں اس کے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ وہ جیسے چاہے اپنے والدین کی خدمت کرے۔ میں کبھی اس کی راہ میں حائل نہیں ہوں گا۔"

وہ جو بھی کہتا مجھے کون سا ملکہ تک پہنچانا تھا۔

اور اس کے بعد بھی میں نے دوبارہ اس سے بات کی تھی۔ وہ از حد مایوس اور دلگرفتہ تھا لیکن میں نے باتوں باتوں میں اسے جتا بھی دیا تھا کہ میں۔

اور مجھے یقین تھا کہ ایک روز وہ مجھے ضرور پروپوز کرے گا۔ کیونکہ میں بھی ذہین تھی جیسے ملکہ۔ لیکن دنیا تو ذہین لڑکیوں سے بھری ہوئی ہے مگر ہر ذہین لڑکی ملکہ نہیں ہوتی۔ یہ بات میں نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی اور منتظر تھی کہ کس روز وہ اپنے والدین کو میرے گھر بھیجتا ہے۔ باتوں باتوں میں اسے میں نے اپنے گھر کا اتا پتا بھی بتا دیا تھا اور پڑوس میں زینب آپا کا فون نمبر بھی دے دیا تھا۔ یہ ہی فون نمبر میرے ہاسٹل کے کاغذات اور یونیورسٹی میں بھی موجود تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ ایک روز وہ ضرور۔

کیونکہ میں ذہین تھی اور اسے ذہانت اٹریکٹ کرتی تھی۔

میں سادا اور بے ریا تھی۔ مجھے دل چھل نہیں آتے تھے۔ میرا دل خوبصورت تھا۔ یہ میرے اپنے خیالات تھے اپنے متعلق' دوسروں کے خیالات کی مجھے پروا نہیں تھی۔ اور پھر ایک روز اس کا فون آگیا۔

زینب آپا کا بیٹا بلانے آیا تو میں سر کے بل دوڑتی ہوئی گئی۔

وہ عبدالخالق ہی تھا۔ اس کی آواز میں زندگی تھی اور چہکار۔

"سنو حاجرہ! ہم تمہارے شہر آ رہے ہیں۔ میرے امی "ابو اور میں۔"

اور میں گنگ سی رہ گئی تھی۔

"کب۔" بمشکل میرے حلق سے نکلا تھا۔

"یہ تو سرپرائز ہے۔"

"میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ہم ذات کے ترکھان ہیں۔ آپ کے اماں ابا کو کوئی اعتراض نہیں ہوا؟"

"نہیں بھئی سب اللہ کی مخلوق اور انسان ہیں اور یہ ذاتیں قبیلے تو پہچان کے لیے بنائے گئے ہیں اور میرے والدین تو اس دنیا کی مخلوق ہی نہیں ہیں حاجرہ جی! آپ ان سے ملیں گی تو دیکھیں گی۔ اور آپ کا سچ اچھا لگا تھا۔ آپ سب ہی باکمال ہیں۔"

وہ تو جیسے خوشیوں کے جھولے میں جھول رہا تھا۔

میں اتنے دور سے بھی اس کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ دیکھ رہی تھی۔ اور یہ کیسی انہونی ہوئی تھی۔ میں حاجرہ منیر حسین ایک نچلے متوسط طبقے کی لڑکی اور وہ۔۔۔ میں نے سوچا ابھی بے بے اور اماں سے بات نہیں کروں گی۔ وہ خود ہی آ کر۔ میری خوشی میرے وجود کے ہر ہر موسے پھوٹتی تھی اور بے بے حیران ہو کر مجھے دیکھتی تھی۔

جی چاہتا تھا دھمال ڈالوں۔ ہوا میں ہاتھ پھیلا کر گول گول گھوموں بڑی انہونی ہو گئی تھی۔

"بے بے! ایک سہیلی کا فون تھا اس نے بتایا ہے۔ یونیورسٹی میں ٹاپ کرنے پر سونے کا میڈل ملے گا۔ خالص سونا۔ پورا ایک تولے اور مجھے پتا ہے یہ میڈل مجھے ہی ملنا ہے۔" میں نے بروقت بات بنائی تھی۔ اور باتیں بنانا تو مجھے خوب آگیا تھا۔

"اچھا میں دعا کروں گی کہیں کمبخت گڑبڑ نہ کر دیں پانی چڑھا میڈل نہ دے دیں۔"

اور گڑبڑ تو ہو گئی تھی۔ کاش میں بے بے سے کہتی وہ

میرے لیے دعا کرے کہ عبدالخالق کی گاڑی میرے گھر کے دروازے پر آکر رکے۔ اس کے ماں باپ میرے لیے جھولی پھیلائیں' لیکن میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔ بے بے میرے گولڈ میڈل کے لیے دعا کرتی رہی اور میں خوابوں کے ہنڈولوں میں عبدالخالق کے سنگ جھولتی رہی اور ماما الطاف مٹھائی کا بڑا ڈبا اٹھائے چلا آیا۔ یہ موتی چور کے بڑے بڑے لڈو اسپیشل کھوئے والے۔

"ہم نے ملکہ کا رشتہ طے کردیا ہے۔ بس اچانک ہی وہ لوگ آگئے اور منہ میٹھا کرکے ہی اٹھے۔ آپ کو بھی اطلاع نہ دے سکا۔"

"کوئی بات نہیں پتر! اللہ اپنی ملکہ کا نصیب اچھا کرے۔ کیسے لوگ ہیں۔ تحقیق کرلی۔ لڑکا دیکھا۔"

"لڑکا ساتھ ہی آیا تھا۔ ڈاکٹر ہے۔ اپنی ملکی کے کالج میں ہی پڑھتا تھا۔ عبدالخالق نام ہے۔"

ماما الطاف تفصیل بتارہا تھا اور میرے جھولے کی رسیاں اچانک ٹوٹ گئی تھیں اور میں اونچائی سی گر کر چُور چُور ہوگئی تھی۔

یہ کیا ہوا تھا۔ یہ میرے خوابوں کے شیش محل میں کس نے آگ لگادی تھی۔

میں نے آنکھیں مل مل کر ماما کی طرف دیکھا۔

کیا میں نے خواب تو نہیں دیکھا۔ کیا میرے کانوں نے غلط تو نہیں سنا۔ لیکن ماما الطاف ڈبا کھول کر اب لڈو نکال کر بے بے کو کھلا رہا تھا۔

"لے حاجرہ! تو بھی منہ میٹھا کر۔" بے بے نے زبردستی میرے منہ میں لڈو ڈالا اور میں اٹھ کر غسل خانے کی طرف بھاگی۔ کلیاں کرکرکے منہ صاف کیا تھا۔ کتنا کڑوا اور زہریلا لڈو تھا۔ کڑواہٹ اندر تک گھل گئی تھی۔

یہ کیسے ہوگیا تھا۔ کتنی انہونی سی تھی نا جو بارات میرے دروازے پر آنا تھی وہ کسی اور کے آنگن میں اتر گئی تھی۔ مہینوں میں سوچتی رہی کہ یہ کیسے ہوا اور پھر پتا چلا عبدالخالق اپنا کیس لڑنے خود ملکہ کے پاس پہنچ گیا تھا۔

ملکہ ہاؤس جاب کے لیے لاہور چلی گئی تھی۔ اور عبدالخالق تو وہیں تھا اور میں نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ عبدالخالق اس سے پوچھ بھی سکتا ہے۔ اپنے تئیں تو میں نے اسے پکا پکا یقین دلادیا تھا کہ ملکہ اور وہ یہ ناممکن ہے۔

ملکہ نے میرا بھرم رکھ لیا تھا۔ اس نے عبدالخالق کو نہیں بتایا تھا کہ میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی اور یہ سب مجھے ملکہ نے اس روز بتایا تھا' جب وہ ڈاکٹر عبدالخالق کے ساتھ مزید تعلیم کے لیے امریکہ جارہی تھی اور میں شرم سے پانی پانی ہوگئی تھی۔ اور یہ تو مجھے بہت بعد میں پتا چلا تھا لیکن اس سے پہلے تو میں تڑپ تڑپ کر روئی تھی۔ کمرا بند کرکے پلنگ کی پٹی پر سر مار مار کے۔

"یا اللہ! میں کیوں نہیں' وہ کیوں؟"

میری ساری پلاننگ فیل ہوگئی تھی اور میرے جھوٹ کسی کام نہیں آئے تھے اور عبدالخالق دھوم دھام سے اسے بیاہنے آگیا تھا۔ اس دوران میری ملکہ سے صرف دوبارہ ملاقات ہوئی تھی۔ ایک بار وہ ملنے کے ساتھ آئی تھی۔ میں نے اسے منگنی کی مبارک باد بھی نہیں دی تھی حالانکہ جب وہ اماں کا بی پی چیک کررہی تھی تو اس کی لانبی پتلی انگلیوں والے ہاتھ میں اس انگوٹھی کو میں نے بہت غور سے دیکھا تھا ہاتھوں کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت لگتی۔

"آپ اپنے کھانے میں نمک کم کردیں۔" اس نے اماں سے کہا تھا۔

"بڑی عجیب بات ہے پھوپھی! ہم دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں لیکن خود کو وہی نصیحت کرنا بھول جاتے ہیں۔"

"ہائے ہائے بیٹی! کیا تمہارا ابھی بی پی ہائی ہے۔" بے بے نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

"نہیں بے بے' ایسے ہی ایک بات کی تھی۔" اس نے میری طرف دیکھا تھا جتاتی نظروں سے۔ "ہاں مجھے نصیحت کرتی تھی کہ میں کسی پر اعتبار نہ کروں مگر اس نے مجھ پر اعتبار کیا تھا۔ میں نظریں چرا کر ہانڈی

پکانے کے بہانے باورچی خانے میں آ بیٹھی تھی۔

دوسری بار میری ملاقات اس سے لاہور میں ہوئی تھی۔ وہ ایوارڈ کی تقریب میں شرکت کرنے آئی تھی۔ اور ملا اور عبدالخالق کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ میری ہر کامیابی پر خوش ہونے والی ملکہ بے حد سنجیدہ تھی۔ جب یونیورسٹی سے آپا زینب کے گھر فون آیا تھا تقریب انعامات میں شرکت کے لیے تو میں نے بہت کوشش کی تھی کہ اس بار تو ابا میرے ساتھ چلیں لیکن ابا نے ماما کو کہہ دیا تھا۔

میں نے ٹاپ کیا تھا اور مجھے گولڈ میڈل ملنا تھا۔ عبدالخالق نے بہت دل سے مجھے مبارک باد دی تھی اور "ٹریٹ ادھار رہی" کہہ کر مسکرا رہا تھا۔ لیکن ملکہ نے ایک بار بھی ٹریٹ کے لیے نہیں کہا تھا نہ مسکرائی تھی۔

"یا اللہ کوئی انہونی ہو جائے ایسی کہ مجھے شادی میں نہ جانا پڑے۔ میرا دل تو پھٹ ہی جاتا دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر۔ اور انہونی ہو ہی گئی تھی۔ میں چھت پر دھلے کپڑے لٹکانے گئی تو بالٹی سمیت سیڑھیوں سے نیچے آ گری تھی۔ میرے پاؤں میں فریکچر ہو گیا تھا اور میں پلاسٹر چڑھوا کر گھر ہی بیٹھ گئی تھی۔

اماں اور بے بے شادی سے واپس آئیں تو بس ان کی زبان پر عبدالخالق اور اس کے گھر والوں کا ہی ذکر تھا۔ کاش میں ان کو روک سکتی۔ میں کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر لیٹ گئی تھی۔ میں اگر اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی تو ان کے متعلق سننا بھی نہیں چاہتی تھی۔

اور پھر شادی کے بعد وہ سب کے ساتھ دعوت پر آئی تھی۔ اس کی شادی کو ایک ہفتہ ہوا تھا اور وہ عبدالخالق کے ساتھ میکے آئی تھی تو اماں نے جھٹ سے دعوت دے دی تھی۔

"ارے! تم تو سچ مچ پلاسٹر چڑھائے بیٹھی ہو۔ میں سمجھی کہ شادی میں شریک نہ ہونے کا بہانہ کیا ہے۔"

وہ نیچے پاؤں کے بل بیٹھی میرے پاؤں کا معائنہ کر رہی تھی۔

"کتنے ہفتوں کا پلاسٹر چڑھایا ہے ڈاکٹر نے؟" اس نے ابا سے پوچھا تھا۔

"تین ہفتوں کا ہے۔"

"پاؤں ٹیڑھا تو نہیں ہو جائے گا؟" بے بے کو بہت فکر تھی شاید انہیں ڈر تھا کہ پھر میرا کوئی رشتہ نہیں آئے گا کیونکہ اب انہیں ایک ہی فکر کھائے جاتی تھی کہ جلد از جلد مجھے گھر بار کا کر دیں۔

"نہیں بے بے! کچھ نہیں ہو گا۔"

وہ کھڑی ہو گئی تھی۔ عبدالخالق کے ساتھ کھڑی وہ اچھی لگ رہی تھی۔ ہلکا ہلکا میک اپ کیے میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ اور آج تو اس کی چھینی ناک بھی بری نہیں لگ رہی تھی۔ اس نے گلے میں ایک نازک سا لاکٹ پہن رکھا تھا۔ سادگی میں بھی پرکاری تھی۔

"بہت اچھی لگ رہی ہو ملکہ!"

بے اختیار ہی میرے لبوں سے نکل گیا تھا۔ اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا تھا۔

پھر ایک دن اماں نے بتایا وہ امریکہ جا رہی ہے۔ ملا الطاف اماں کو بتا کر گیا تھا کہ وہ ان سے ملنے آئی ہوئی ہے۔ اور میں خواہش کے باوجود اس سے ملنے نہ جا سکی۔ حالانکہ اماں نے کتنی بار کہا میں ٹالتی رہی۔ مجھ میں اسے دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ میں کیسے دیکھتی اسے اور برداشت کرتی اور پھر وہ خود ہی اماں سے ملنے آ گئی۔

میں اسے کمرے میں لے آئی تھی۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی اپنی چوڑیوں سے کھیلتی رہی۔ اور پھر سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

"حاجرہ! ہر آدمی کو وقت آنے پر ہر وہ چیز مل جاتی ہے، جو اس کے نصیب میں لکھی ہوتی ہے۔ تمہیں بھی وقت آنے پر اپنے نصیب کا حصہ ضرور ملے گا۔ اب کسی کا نصیب چھیننے کی کوشش مت کرنا حاجرہ!"

مجھے لگا جیسے اس نے میرے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو میرا رخسار جل اٹھا تھا۔ میرا سر جھک گیا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ تم۔۔۔ لیکن میں بھول گئی تھی ناکہ گہرے سے گہرا دوست بھی آج کل کے دور میں آپ کے ساتھ مخلص نہیں ہو گا۔"

اس نے شاکی نظروں سے مجھے دیکھا اور میں یہ بھی نہ کہہ سکی کہ جو مخلص نہیں ہوتا وہ آپ کا دوست ہی نہیں ہوتا۔ اور میں تو کبھی بھی اس کی دوست نہیں تھی وہ جب پہلی بار ماما کے ساتھ ہمارے گھر آئی تھی تو جلن اور حسد کی پنیری تو اسی روز میں نے اپنے دل کی زمین میں لگالی تھی۔

"ملکہ وہ۔ میں سوری!" میں اس سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے حاجرہ!" اس سارے عرصے میں پہلی بار میں نے اس کے ہونٹوں پر اپنے لیے وہی مہربان سی مسکراہٹ دیکھی، جو ہمیشہ میرے لیے اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوتی تھی۔

"میں انسانی کمزوریوں پر یقین کرتی ہوں حاجرہ! بھوک آدمی کو بڑا خوار کرتی ہے۔ چاہے وہ کیسی بھی بھوک ہو، روٹی کی، دولت کی، شہرت کی رفاقت کی۔ آدمی کا دل بھرا ہونا چاہیے دل بھرا نہ ہو تو نہ لالچ ختم ہوتا ہے نہ بھوک مٹتی ہے۔"

میں سر جھکائے بیٹھی رہی اس نے مجھے گلے لگایا پیار کیا اور عبدالخالق کے ساتھ دوسرے دیس چلی گئی کچھ عرصے بعد اس نے ماما اور رباب کو بھی بلا لیا۔

اور بے بے میرا نصیب کھلنے کے لیے لمبے لمبے وظیفے کرنے لگی۔ اور دن میں نہ جانے کتنی بار ٹھنڈی آہیں بھرتیں۔

یہ میرے من کا کلونس ہی تو تھا کہ بے بے اور اماں کے سارے وظیفے اکارت جا رہے ہیں اور میں کالج کے برآمدوں، کمروں، لانوں میں ۔۔۔ میں لڑکیوں سے گلاب لیتے ہوئے کسی انہونی کا انتظار کرتی ہوں۔ لڑکیاں جو میرے لمبے بالوں کی تعریف میں بلیک بورڈ پر شعر لکھتی ہیں اور مجھے پھولوں کے تحفے دیتی ہیں۔ ایسے ہی جیسے مس فریدہ اور مسز سعید کو دیتی تھیں اور میں مسکرا کر تھینک یو کہتے ہوئے اور پھول وصول کرتے ہوئے کسی شہزادے کا انتظار کرتی ہوں۔

مگر کہیں سے آتا لڑکیوں کا شور مجھے چونکا دیتا ہے اور میں آگے بڑھ جاتی ہوں۔ میرے پیچھے میری اونچی ہیل کی ٹک ٹک ہوتی ہے اور لڑکیوں کی ہنسی۔

اور کوئی انہونی نہیں ہوتی۔

حالانکہ میں نے اپنے من کی کالک خوب مانجھ مانجھ کر صاف کر دی ہے کہ آج کل پرسوں کبھی تو کوئی عبدالخالق میرے دروازے پر اچانک دستک دے گا اور کہے گا اصل خوبصورتی تو من کا حسن ہے اور تمہارا من بہت خوبصورت ہے اور دل بھرا ہوا۔

اپنی کولیگز کی اور اپنے محلے کی لڑکیوں کی شادیوں اور منگنیوں پر اتنا حلق پھاڑ پھاڑ کر گاتی ہوں کہ گلا بیٹھ جاتا ہے۔ تالیاں پیٹ پیٹ کر ہتھیلیاں لالوں لال ہو جاتی ہیں۔ اتنا ہنستی ہوں کہ آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں اور میں بے آواز چیخ چیخ کر کہتی ہو۔

"دیکھو ملکہ عبدالخالق! میں نے اپنے بھانڈے بھر لیے ہیں اور اپنی بھوک مار دی ہے پھر بھی۔ پھر بھی کوئی۔۔۔ اور منوں وزنی سلوں تلے دبا میرے اندر کا ساڑ کہیں نہ کہیں کسی جھری سے مجھے چٹکیاں بھرتا ہے۔ بتیس، تینتیس، چونتیس، پینتیس سال کی ہو گئی ہو حاجرہ منیر حسین اور کوئی من کا قدردان نہیں ملا تجھے تو خود کوشش کیوں نہیں کرتی کیوں نہیں خود بڑھ کر۔۔۔

اور اس روز میں عنابی رنگ کی لپ اسٹک لگاتی ہوں کہ میرے چہرے پر بجتی ہے۔ مسکارے سے پلکوں کو بوجھل کرتی ہوں۔ بلشر سے گال دہکاتی ہوں۔ چٹیا کے بل کھول دیتی ہوں۔ گھر سے باہر قدم رکھتے ہی دوپٹا سر سے سرک جاتا ہے لیکن صرف ایک لمحے کے لیے۔۔۔ دوسرے ہی لمحے میں دوپٹا اچھی طرح اپنے گرد لپیٹے سر جھکائے گزر جاتی ہوں اور ہونٹ ٹشو سے رگڑ رگڑ کر صاف کر دیتی ہوں کہ میرا دل بھرا ہوا ہے۔

اماں اور بے بے وظیفے پر وظیفے کیے جاتی ہیں اور میں کالج کے برآمدوں، لانوں اور کمروں میں لڑکیوں سے پھول وصول کرتے ہوئے کسی انہونی کا انتظار کرتی ہوں۔

✡